الصلوٰۃ خمسۃ

نمازِ پنجگانہ
کا
قرآنی ثبوت

از
علامہ تمنا عمادی مجیبی پھلواروی ؒ

ebooks.i360.pk

ناشر
الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
مکان نمبر ۳-۷-۱ے، بلاک نمبر ۱، ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰
فون: ۶۲۱۴۳۹ — ۶۲۷۸۴۰

الصلوٰۃ خمسۃ

نمازِ پنجگانہ کا قرآنی ثبوت

از
علامہ تمنّا عمادی مجیبی پھلواروی ؒ

ناشر
الرّحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
مکان نمبر ۳-۷-۱ اے، بلاک نمبر ۱، ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰
فون: ۶۲۱۴۴۹ — ۶۲۷۸۴۰
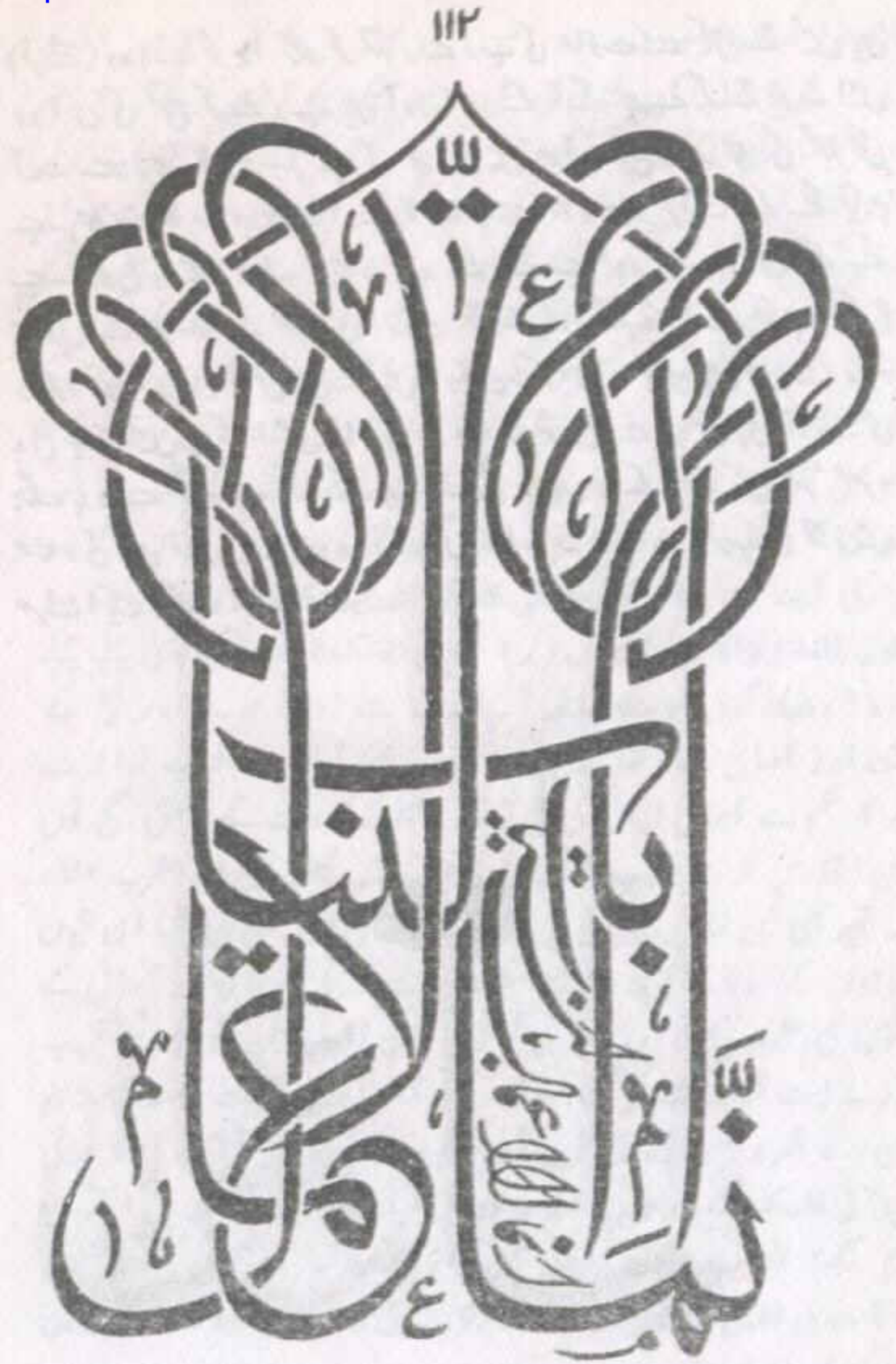
بیشک اعمال کا دار و مدار نیّت پر ہے

اشاعت : فروری ۱۹۹۸ء
تعداد کتب : ۶۰۰
صفحات : ۱۱۲
قیمت : ۲۵ روپے صرف

حرف اوّل

پاکستان کی زمین بہت زرخیز ہے یہاں ہر نیا خیال عقیدہ کی تمام حدود پھلانگ کر ثبوت پہنچ جاتا ہے۔ میرے خیال میں پاکستان میں جتنے طبقاتِ فکر ہیں اتنے کسی ملک میں نہیں۔ چنانچہ ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو صرف تین نمازوں کو مانتا ہے اور پڑھتا ہے۔ حالانکہ تواتر کے ساتھ یہ ثابت ہے کہ نمازیں پانچ ہی تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پانچ ہی نمازیں ادا کیں ان کے انتقال کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں اور ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی پانچ پانچ نمازیں ہی ادا کیں۔ چنانچہ آج تک یہی چلا آرہا ہے کہ ہر طبقۂ فکر اور ہر ملک میں پانچ نمازیں ہی ادا کی جاتی ہیں۔ جیسا کہ غیر مسلم حضرات تک یہ بات جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہاں ایک دن میں پانچ نمازیں ہی ہیں لیکن وائے حسرت کہ پاکستان میں مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو صرف تین نمازوں کا قائل ہے بلکہ وہ قرآن سے یہ ثابت کرنے کی جرأت کرتا ہے کہ قرآن سے صرف تین نمازوں کا حکم ملتا ہے۔ بہرحال مسلمانوں کے ایک دردمند طبقہ کے ایک جیّد عالمِ دین نے یہ محسوس کیا کہ یہ دین کے خلاف ایک سازش ہے اور انہی قرآنی آیات سے یہ ثابت کیا ہے کہ کس آیت سے صرف ایک نماز فرض ہوئی وہ بغیر تعیّن وقت کے تھی اور کسی بھی وقت پڑھی جا سکتی تھی۔ اس کے بعد ایک دور ایسا آیا کہ دو نمازوں کا حکم ہوا اور وہ دونوں نمازیں وقت اور تعیّن اوقات کے ساتھ تھیں پھر ایک آیت کے ذریعہ تین نمازیں اور پھر چار اور وہ آیتیں نشان دہی کے ساتھ قرآن میں موجود ہیں اور جب مدینہ ہجرت ہوئی تو پانچ نمازیں ہو چکی تھیں اور پانچ نمازوں کے اوقات اور ان کی فرضیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دی گئی۔ چنانچہ تین نمازوں کے بانی نے جو کتاب الصّلوٰۃ کے نام سے شائع فرمائی تھی اس کے جواب میں نمازِ پنجگانہ تمنّا عمادی صاحب نے تحریر فرما کر ملّت پر ایک احسانِ عظیم کیا ہے۔ انھوں نے عقائد پر اور بھی کتابیں لکھی ہیں مثلاً "جمع القرآن" کہ قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی زندگی میں ہی مکمل ایسی حالت میں موجود تھا جس ترتیب سے آج موجود ہے۔ یہ عقیدہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے قرآن کی تعلیمات کے بالکل برعکس ہے۔ ان کی کتاب "انتظار مہدی اور مسیح" ملاحظہ فرمائیں۔

بہرحال یہ چند باتیں تھیں جو بیان کرنا تھیں۔ باقی باتیں تو آپ کتاب دیکھ کر خود ہی ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

ناشر

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عبادت اور پوجا کا فرق

یوں تو عبادۃ ایک عربی لفظ ہے۔ معنی مصدری میں بھی مستعمل ہے مگر زیادہ تر حاصل مصدر کے مفہوم میں مستعمل ہے۔ "وہ عبادت میں مصروف ہیں۔" یہاں معنی مصدری مراد ہے۔ اور "نماز ایک عبادت ہے۔" اس جملے میں حاصل مصدر کا مفہوم ہے اس کا ہندی ترجمہ بمعنی مصدری "پوجنا" اور بمعنی حاصل مصدر "پوجا" ہی ہوگا۔ مگر باعتبار اصطلاح عرفی و محاورہ اسلامی طریق پرستش کو عبادت کہتے ہیں اور اہل کتاب کے طریق پرستش کو بھی اور ہندوؤں کے طریق پرستش کو پوجا کہتے ہیں۔ اہل کتاب یہود و نصاریٰ میں عبادت ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے ادا کی جاتی ہے، جو جذبہ عبادت سے بڑی حد تک خالی ہوتی ہے اور افسوس ہے کہ یہی حال عام مسلمانوں کا بھی ہوگیا ہے۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون۔**

پوجا

مگر پوجا میں جذبات ظاہری اعمال کے ساتھ ضرور ہوتے ہیں۔ ہندوؤں کا معبود پتھر کا ہو یا مٹی کا ان کے سامنے موجود ہوتا ہے اس لئے وہ مندر میں جذبہ عقیدت کے ساتھ آتے ہیں اور اپنے دیوتا کی مورتی کے آگے جذبہ عقیدت کے ساتھ ڈنڈوت کرتے ہیں پرنام کرتے ہیں اور پوجا کی رسم ادا کرتے ہیں۔ وہ اپنے دیوتاؤں سے امیدیں رکھتے ہیں اور ان کی ناخوشی سے ڈرتے بلکہ بہت ڈرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے دیوتا ان کی پوجا ہی سے خوش رہ سکتے ہیں۔ کوئی دیوتا اپنے پجاریوں کے اخلاق و معاملات و اعمال کو نہیں دیکھتا۔ ان کے پجاری جو چاہیں کرتے رہیں۔ مگر ان کو پوجتے ہیں۔

اس لئے کوئی ہندو بطور خود اپنی نیک فطرتی کی وجہ سے اپنے اخلاق و معاملات کو درست رکھے یہ اور بات ہے مگر وہ یہ نہیں سمجھتا کہ ہمارے دیوتا ہماری بداخلاقی و بدمعاملگی و بداعمالی کی وجہ سے ہماری پوجا کو قبول نہیں کریں گے اور ہم سے کوئی مواخذہ کریں گے۔ ہندو یہی جانتا ہے کہ ہمارا پربھو تو صرف پوجا ہی سے خوش رہتا ہے پجاری کے اخلاق و معاملات و اعمال کو نہیں دیکھتا۔

عبادت

قرآن مجید نے عبادت کا مفہوم جو بتایا ہے وہ بہت وسیع ہے یعنی "اپنے کو اللہ کا بندہ سمجھتے ہوئے اور اس کی بندگی کا حق ادا کرتے ہوئے پوری زندگی بسر کرنا"۔ اسلام میں عبادت دل و دماغ کا کام ہے۔ دل میں جذبہ عبادت کا ہر وقت موجود رکھنا در حقیقت عبادت ہے۔ جذبہ عبادت متعدد جذبات کے مجموعے کا نام ہے۔ والہانہ شیفتگی۔ فدویانہ گرویدگی۔ عاجزانہ فروتنی۔ مخلصانہ نیازمندی اور غلامانہ حاضرباشی۔ ان پانچ جذبوں کے مجموعے کا نام جذبہ عبادت ہے۔ غلامانہ حاضرباشی سے مراد یہ ہے کہ بندہ اپنے کو ہر وقت اپنے مالک اپنے رب کی بارگاہ میں حاضر سمجھے اسلام و ایمان و احسان والی حدیث میں احسان کا مفہوم بتایا گیا ہے۔ **ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک** تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ کیونکہ تم اگر اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تم کو ضرور دیکھ رہا ہے۔ (فانہ پر فا تعلیلیہ ہے) جو بندہ یہ تصور قائم رکھے کہ ہم ہر وقت اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہیں اور وہ ہمیں اور ہمارے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے۔ کیا اس سے کبھی جانتے بوجھتے نافرمانی ہو سکے گی۔؟

اس جذبہ عبادت کو دل و دماغ میں ہر وقت بیدار رکھنے کے لئے پانچ وقت کی نمازیں فرض کی گئی ہیں۔ حکم ہے **اقم الصلوٰۃ لذکری** نماز (کی پابندی) قائم رکھو۔ مجھ کو یاد رکھنے کے لئے جو شخص ہر چند گھنٹے کے بعد اپنے مالک کی

بارگاہ میں حاضری دیتا رہے گا۔ رات کو سوئیگا تو بارگاہ میں حاضری دیکر سوئے گا یہ خیال رکھتے ہوئے کہ فجر کو سویرے اٹھ کر مالک کی بارگاہ میں حاضری دینا ہے اور سو کر اٹھے گا تو ضروریات سے فارغ ہو کر پہلے مالک کی بارگاہ میں حاضری دے گا اور مصروفیتوں میں نماز کے وقت کا خیال رکھے گا کہ مالک کی بارگاہ میں حاضری کو کبھی بھول نہ جائے۔ ایسا شخص اپنے مالک کی نافرمانی جانتے بوجھتے کبھی نہیں کرسکتا۔ وہ جانتا ہے کہ میرے اخلاق و معاملات اور سارے اعمال کی مالک کے یہاں پرسش ہوگی۔ میں صرف نماز روزہ اور ایک بار حج کرکے مالک کو اپنے سے راضی نہیں رکھ سکتا اس لئے اس کے اخلاق اس کے معاملات اور اس کے سارے اعمال مالک کی مرضی اور مالک کے حکم کے مطابق ہی ہوں گے اگر اس سے کبھی بھولے چوکے یا کبھی بتقاضائے بشریت بالقصد بھی کوئی نافرمانی کسی حکم کی بھی ہو جائے گی تو وہ بعد کو بہت پچھتائے گا۔ مالک کے آگے روئیگا گڑگڑائیگا اور توبہ کریگا اور پھر کوئی ایسا کام نہ کرے گا۔

توبہ ناخوش یہی احساس ہے اک سخت عذاب
تیرے مجرم کو سزا اس کی خطا دیتی ہے

غرض تعمیل حکم کے ذریعے ہاتھ پاؤں سے یا مال سے! ضبط نفس سے جذبہ عبادت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ جذبہ عبادت کے ماتحت نماز، روزہ، حج، زکوۃ ادا ہو تو عبادت ہے دل میں جذبہ عبادت نہ ہو مگر ظاہری اعمال سے عبادت کا کام کیا جائے تو وہ عبادت کی نقل ہے عبادت نہیں ہے۔

غرض پوجا صرف اپنے دیوتا کو خوش رکھنے کے لئے وقتی طور سے کی جاتی ہے۔ اور عبادت ان جذبات بندگی کو جو ہر وقت دل و دماغ میں رہتے ہیں بیدار رکھنے کے لئے کی جاتی ہے۔

* *

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین الرحمن الرحیم مالک یوم الدین والسلام علی المرسلین وسلام علی عبادہ الذین اصطفی لاسیما علی خاتم النبیین المصطفی وعلی الہ واصحابہ واھل بیتہ امہات المومنین۔
الھم صلی وسلم وبارک علیہ وعلیھم جمعین۔

ادارہ بلاغ القرآن لاہور کی طرف سے شائع کردہ کتاب "**الصلوۃ**" میں سورۃ النساء کی آیت کریمہ **۱۰۳ ان الصلوۃ کانت علی المومنین کتابا موقوتا** (نماز سارے مومنین پر پابندی وقت کے ساتھ فرض ہے) میں **الصلوۃ** کے لفظ پر جو الف لام ہے، اسے الف لام استغراق بتا کر اور قرآنی آیات میں تحریفات کثیرہ کے ذریعہ صرف تین وقت کی نماز (فجر، ظہر اور عشاء) کو فرض قرار دے کر، استغراق کو حصر کے معنی میں لے کر صرف انہی تین وقتوں کی نماز کو قرآنی نماز قرار دیا ہے۔ اور وہ بھی دو دو رکعتیں اور ہر رکعت میں ایک قیام یعنی رکوع کے بعد والے قومہ کو بھی حذف کرکے اور صرف ایک سجدے کو قرآنی نماز کہا گیا ہے اور مصنف کتاب مذکور کی طبعزاد دو دو رکعت مذکورہ تین وقتوں کے سوا عصر اور مغرب کی فرض نمازوں کو اور سنت اور نفل کی ساری نمازوں کو خلاف قرآن اور ناجائز قرار دیا ہے۔ فقط تہجد کی نماز صرف دو رکعت نفل قرار دے کر قرآنی نماز لکھا ہے۔

شاید اس کتاب کے مصنف نہ الف لام کی قسمیں جانتے ہیں نہ الف لام استغراق کا مفہوم سمجھتے ہیں۔ نہ استغراق اور حصر کے مفہوموں میں جو فرق ہے، اس سے واقف ہیں۔ انہیں کچھ نحوی اصطلاحوں کے الفاظ یاد ہیں مگر ان کے مفاہیم سے وہ بالکل بے خبر ہیں۔ عوام پر اپنی علمی قابلیت جتانے کے لئے وہ کہیں کہیں اصطلاحی الفاظ استعمال کرجاتے ہیں۔ انہیں اس کی مطلقاً خبر نہیں کہ نہ الف لام کبھی حصر و قصر کے لئے آتا ہے اور نہ استغراق کا مفہوم حصر کا مستلزم ہے سورہ حجرات کی آیت ۱۰ **انما المومنون اخوۃ** (سارے مومنین (باہم) بھائی بھائی ہیں) یہاں **المومنون** پر الف لام استغراق

کا ہے۔ اور حصر کا مفہوم پیدا کرنے کے لئے انما کا لفظ لایا گیا ہے۔ اگر الف لام استغراق ہی سے حصر کا مفہوم پیدا ہوجاتا تو **انما** کا لفظ بے ضرورت کیوں لایا جاتا، استغراق سے سے جامعیت کا مفہوم پیدا ہوتا ہے اور حصرو قصر سے مانعیت کا مگر مصنف کتاب **الصلوۃ** کو ان باتوں کی کیا خبر۔

فتح جنگ بدر کے بعد سورۃ النساء کا بارہواں رکوع نازل ہوا ہے۔ قرآن مجید کے ساتھ یہ نہایت گمراہ کن خیانت ہے کہ درمیان سے کسی آیت کو لے لیا، جیسے وہی ایک آیت مستقل طور سے نازل ہوئی تھی۔ اور اس کو ماقبل اور مابعد کی آیتوں سے کوئی تعلق نہیں اور پھر اس آیت سے ایسا مفہوم نکالنا جو عہد نبوی سے لے کر دور حاضر تک کسی دوسرے کو اس کا وہم بھی نہ ہوا ہو۔ اسی قدر نہیں بلکہ ادب عربی کی رو سے بھی غلط ہو۔ معمولی درجہ کا عربی داں بھی جس کو سنکر ہنس دے۔ کیا قرآن مجید پر اور دین اسلام پر اس سے بڑھ کر بھی کوئی ظلم ہوسکتا ہے۔؟

سبب تالیف:۔

یہ رسالہ دراصل ادارہ مذکور کی شائع کردہ اسی کتاب "**الصلوۃ**" کی فریب کاریوں سے ان سیدھے سادے مسلمانوں کو باخبر کرنے کے لئے لکھ رہا ہوں جو دو وقت کی نماز اور تین وقت کی نماز کا ادعا کرنے والوں کے گمراہ کن لٹریچر سے متاثر ہوکر دو وقت یا تین وقت کی نماز پڑھتے ہیں۔ اور عصرو مغرب کی یا ظہر کی بھی نماز پڑھنے کو قرآن مجید کی انتہائی مخالفت سمجھتے ہیں۔ اور نفل و سنت کی نمازیں پڑھنے کو "شرک" تصور کرتے ہیں۔ خدا کے لئے ایسے گمراہ کن فریب میں نہ پڑیئے اور اپنی عاقبت برباد نہ کیجئے۔

الھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔
واقم الصلوۃ ان الصلوۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر ولذکراللہ اکبر۔
(عنکبوت آیت ۴۵)

"اور نماز پابندی سے قائم کرلو، بلاشبہ نماز بے حیائی کی باتوں، اور

ناپسندیدہ کاموں سے روک دیتی ہے۔ اور اللہ کی یاد بہت بڑی (چیز) ہے۔"

تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم

آل عمران آیت ۶۴

ہر مسلمان اتنا ضرور جانتا ہے کہ پانچ وقت کی نماز دین اسلام میں ہر مسلمان پر فرض ہے۔ بلکہ غیر مسلموں کی بہت بڑی اکثریت جانتی ہے کہ مسلمانوں پر پنجگانہ نمازیں فرض ہیں۔

چودہ سو برس سے آج تک دنیا کے جس حصے میں بھی مسلمان آباد رہے فرقہ بندی سے پہلے یا بعد ہر فرقے کے مسلمان پانچ وقت کی نماز کی فرضیت پر متفق رہے۔ کسی فرقہ، کسی شہر، کسی دور کے مسلمانوں کو بھی پنجگانہ نماز کی فرضیت سے اختلاف نہ ہوا۔ کسی فرقے کی کتاب حدیث میں ہو یا فقہ میں قدیم سے قدیم تالیف و تصنیف ہو یا جدید سے جدید، آپ ضرور پنجگانہ ہی نماز کی فرضیت کا ذکر اس میں پائیں گے۔

قرآن مبین تو ہر مسلم فرقے کی متفق علیہ کتاب ہے۔ ہر مسلمان چاہے جس فرقے کا بھی ہو۔ قرآن مجید پر ایمان رکھتا ہے۔ اور اس کو اللہ تعالیٰ کی کتاب مانتا ہے۔ اس کے ہر لفظ کی صحت پر ایمان رکھتا ہے۔

اس چودھویں صدی میں بھی جو کچھ لوگ غیر منقسم ہندوستان میں ایسے پیدا ہوگئے تھے اور بعضے اس وقت پاکستان میں نظر آرہے ہیں اور شاید ہندوستان میں بھی ہوں۔ جو قرآن مجید میں صرف دو ہی وقت کی نماز کا ثبوت پاتے ہیں۔ اور بعضے تین وقت کی نماز سے زیادہ قرآن مجید میں نہیں پاتے۔ یہ حضرات بھی قرآن مجید کو ضرور اللہ کی کتاب، تحریف و تصحیف سے ہر طرح محفوظ مانتے ہیں۔ بلکہ قرآن مجید کا سب سے زیادہ مومن و مہیمن خود اپنے کو سمجھتے ہیں۔ میرے مخاطب اس وقت وہی دو وقت یا تین وقت کی نماز ازروئے قرآن مجید فرض ماننے والے ہیں۔ ان سے میں کہتا ہوں کہ:۔

تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم آؤ اس کلمہ کی طرف جو ہمارے اور

تمہارے درمیان یکساں واجب التسلیم ہے۔ (آل عمران آیت ۶۴)

ہم دونوں بتوفیقہ تعالیٰ جب اللہ تعالیٰ پر اللہ تعالیٰ و تبارک کی کتاب قرآن مجید پر، اللہ تعالیٰ کے رسولوں پر اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم پر پھر روز قیامت پر اور قیامت کے دن اعمال کی باز پرس پر ایمان رکھتے ہیں۔ تو پھر روز محشر کی باز پرس سے ڈرتے ہوئے پوری دیانت کے ساتھ قرآنی آیات پر غور کریں۔ کہ واقعی نماز کے متعلق قرآن مبین کیا ارشاد فرماتا ہے۔

من[1] نگویم کہ ایں مکن آں کن ۔ از خدا ترس و کار ایماں کن

اوّل المومنین اور اوّل المسلمین

ہر رسول اپنی امت سے پہلے خود مومن و مسلم ہوئے، ظاہر ہے کہ جو خود مومن نہ ہوگا وہ دوسروں کو کیا ایمان سکھائے گا جو خود مسلم نہ ہوگا وہ دوسروں میں اسلام کی کیا تبلیغ کرے گا۔ یقیناً " پہلے ہر نبی کو ایمان کی تلقین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوئی اور اسلامی فرائض سے ان کو مطلع کردیا گیا نماز کی پابندی کا پہلے حکم انہی کو ہوا پھر ان کے ذریعے ان کی امت کو ایمان و اسلام سے واقفیت حاصل ہوئی۔

ایمان تو نام ہے برحق عقائد کی تصدیق اور دل میں ان کو جاگزیں کرنیکا۔ اسلام نام ہے احکام رب العالمین پر عمل کرنے کا ان میں سب سے اہم حکم نماز کا ہے۔ اس لئے ہر نبی کو سب سے پہلا حکم ایمان کی تلقین کے بعد نماز کا ہوا۔ مثال کے طور پر حضرت موسیٰ علی نبینا و علیہ السلام کا واقعہ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب حضرت موسیٰ ایک جگہ اپنی بیوی کو ٹھہرا کر ان کے تاپنے کے لئے آگ لانے کی غرض سے اس طرف پہنچے۔ جس طرف آگ کے آثار ان کو نظر آئے تھے۔ تو ان کو وہاں آواز دی گئی، اللہ نے اپنا تعارف کرایا اور ایمان کی تلقین فرمائی اور نماز کا حکم دیا۔

(سورہ طٰہٰ آیات ۹ سے ۱۴ تک)

دو چیزیں ایمان کی اصل ہیں۔ ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر، جو

---

[1] ہم یہ نہ کہتے تھے کہ یہ کام کرو اور وہ کام نہ کرو اور اللہ سے ڈرو اور ایمانداری کے کام کرو۔

اللہ تعالیٰ ہی پر ایمان نہیں رکھتا یا اللہ پر تو ایمان رکھتا ہے کہ ایک خالق کائنات ضرور ہے مگر قیامت والے آخری دن پر ایمان نہیں رکھتا۔ اعمال کی جزا و سزا پر یقین نہیں رکھتا۔ وہ جو چاہے گا کرے گا۔ یقیناً" وہ خود غرض، نفع پرست اور ہوا و ہوس کا بندہ رہے گا۔ نہ اس کے اخلاق کا کوئی اعتبار نہ اس کے قول و عہد کا کوئی بھروسا۔ وہ صرف اپنا نفع اور اپنی خوشی ہر کام میں دیکھے گا۔ کمزوروں پر ظلم کرنے سے کبھی باز نہ رہے گا۔ اس سے عدل و انصاف کی امید رکھنا خام خیالی ہے۔ اللہ پر صحیح طور پر ایمان ہو تو پھر اللہ کی کتاب، اللہ کے رسول اور اللہ کے فرشتوں پر بھی ایمان رکھنا ہی ہوگا۔ اور پھر اللہ کی کتاب کی ہدایات اور اللہ کے رسول کی تعلیم کے مطابق اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل بھی کرنی ہوگی۔ اور قیامت کے آخری دن پر ایمان رکھتے ہوئے نافرمانی، سرکشی اور مخلوق پر ظلم کرنے سے بچتے رہنا ہوگا۔ غرض ایمان کی تلقین کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علی نبینا و علیہ السلام کو سب سے پہلے فریضہ بندگی ادا کرتے رہنے کا حکم فرمایا۔ اور اس کی حکمت و وجہ بتلائی۔

واقم الصلوٰۃ لذکری۔ (طٰہٰ آیت ۱۴)

مجھ کو یاد رکھنے کے لئے نماز کی پابندی قائم رکھو۔ (۲۰:۱۴)

واؤ یہاں تفسیری ہے۔ یعنی اس کے پہلے **متصلا**" جو فاعبدنی (میری ہی عبادت کرو) ہے اس کی تفسیر ہے۔ **واقم الصلوٰۃ لذکری۔**

حضرت عیسیٰ علی نبینا و علیہ السلام کو جب ان کی والدہ محترمہ حضرت مریم علیہا السلام گود میں لے کر اپنی قوم کے سامنے پہنچیں تو اس وقت انہوں نے بھی قوم سے جو باتیں کیں اور اپنا تعارف کراتے ہوئے فرمایا۔

واوصنی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ مادمت حیا (سورہ مریم آیت ۳۱)

اللہ نے مجھ کو حکم دیا ہے نماز اور زکوٰۃ کی تازندگی پابندی کا۔ (۱۹:۳۱)

ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی آئی۔ وہ حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعہ آئی۔ جیسا کہ سورۃ بقرہ کی آیت ۹۷ میں مذکور ہے۔ "اس نے (جبریل نے) تو یہ کتاب اللہ کے حکم سے تمہارے دل پر نازل کی ہے۔"

اب قابل غور بات یہ ہے کہ پہلے پہل حضرت جبریل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کس جگہ پہنچے۔ قرآن مجید میں اس کا مفصل ذکر نہیں ہے۔ ایک لفظ کے اشارے سے سمجھا جا سکتا ہے کہ کسی پہاڑ پر پہلے پہل وحی آئی تھی۔ اس کا ذکر انشاءاللہ آگے آئے گا۔

البتہ حدیثوں سے اور سیرت و تاریخ کی کتابوں سے بحیثیت خبر متواتر ثابت ہے کہ پہلے پہل وحی کوہ حرا پر آئی تھی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ حرا ہی پر پہلے پہل حضرت جبریل کو دیکھا تھا۔

ولقد راٰہ بالافق المبین۔ (سورۃ تکویر آیت ۲۳)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت جبریل کو آسمان کے صاف اور واضح کنارے پر دیکھا تھا۔ (۸۱ : ۲۳)

نیز ارشاد ہے۔

وھو بالافق الاعلیٰ ثم دنیٰ فتدلیٰ فکان قاب قوسین او ادنیٰ[1] فاوحیٰ الیٰ عبدہ مااوحیٰ (النجم ۷ ـ ۸ ـ ۹ ـ ۱۰)

اور وہ (حضرت جبریل) آسمان کے بلند کنارے پر تھے پھر قریب آگئے۔ پھر اتر گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دو کمان کے فاصلے پر ہوگئے۔ بلکہ اس سے بھی قریب تر تو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کی طرف جو وحی کرنی تھی۔ بذریعہ جبریل وحی کی۔ (۵۳ : ۷ تا ۱۰)

ان آیات میں گو وحی کی تفصیل مذکور نہیں۔ مگر آغاز وحی اور منصب نبوت و رسالت عطا کرنے والی وحی صیغہ راز کی وحی نہیں ہو سکتی، کہ اس کی تلاش یا اس کے مفہوم کی ٹوہ لگانا ممنوع یا خلاف ادب سمجھا جائے۔

---

[1] او ادنیٰ میں او اضراب کے لئے ہے۔ یعنی بلکہ کے معنی میں آیا ہے جیسے صافات ۱۴۷ میں فارسلناہ الیٰ مائۃ الف اویزیدون میں او بلکہ کے معنی میں آیا ہے اور واؤ بھی بلکہ کے معنی میں آتا ہے۔ جیسے "وما تکون فی شان وما تتلوا منہ من قران و تعملون من عمل الا کنا علیکم شھودا اذتفیضون فیہ۔ (سورہ یونس آیت ۶۱) میں "ولا تعملون من عمل" میں واؤ بمعنی بلکہ ہے اور آگے ایک آیت آتی ہے ما کنت تدری ما الکتاب ولا الایمان" (سورۃ شوریٰ آیت ۵۲) یہاں بھی واؤ بمعنی بلکہ ہی زیادہ مناسب مقام معلوم ہوتا ہے۔ اضراب کے مفہوم میں مفہوم سابق پر ترقی ہوتی ہے۔ جو یہاں موجود ہے....

مشہور و معروف روایت آغاز وحی سے متعلق جو صحیح بخاری وغیرہ میں مذکور ہے اس سے سورہ **علق** کی پہلی پانچ آیتوں (۹۶ : ۱ تا ۵) کے اترنے کو تو بالاتفاق سارے محدثین، سارے اہل سیر، سب فرقوں کے علماء مانتے آرہے ہیں۔ مگر بخاری کی روایت میں بسم اللہ الرحمن الرحیم مذکور نہیں ہے اور یہ غیر ممکن ہے کہ حضرت جبریل نے بغیر بسملہ کے صرف پانچ آیتیں پڑھوائی ہوں۔ باوجود اس کے کہ اس کی پہلی ہی آیت میں حکم ہے کہ :-

اقراء باسم ربک الذی خلق

تمہارا رب جس نے پیدا کیا اس کے نام سے (ابتدا کرتے ہوئے) پڑھو۔

اس حکم کے باوجود بسم اللہ الخ پڑھوائے بغیر اقراء سے پڑھوانا بالکل خلاف عقل ہے۔ مگر دوسری کتابوں میں بسم اللہ کے بھی پڑھوانے کا ذکر ہے۔ کہ سب سے پہلے بسم اللہ الخ ہی پڑھوائی۔ بعض روایتوں میں سورہ فاتحہ کے اسی وقت اترنے کا ذکر ہے۔ جو بالکل قرین قیاس ہے۔ اور علامہ زمخشری کے قول کے مطابق تو اکثر مفسرین کے نزدیک سب سے پہلی وحی قرآنی سورہ فاتحہ ہی ہے۔ مگر یہ سب چیزیں بعد کی ہیں۔ اصل وحی جو یقیناً" سب سے پہلے ہوئی تھی۔ اس کا ذکر کسی کتاب میں نہیں۔ کوئی راوی بھی اسکی روایت نہیں کرتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آغاز وحی کا حال اگر کسی سے بیان کیا ہوگا تو ضرور پورا حال بیان فرمایا ہوگا۔ مگر کوئی روایت مکمل نظر نہیں آتی۔

قرآن مجید ہی میں ہے۔

ما کنت تدری ما الکتاب ولا الا یمان (شوری آیت ۵۲)

اے رسول تم تو واقف بھی نہ تھے کہ منزل من اللہ کتاب کیا ہے (کیسی ہوتی ہے) بلکہ ایمان کی حقیقت سے بھی نا آشنا تھے۔

جو شخص ایمان کی حقیقت خود نہیں جانتا۔ اس کو حقیقت ایمان سے پوری طرح واقف کئے بغیر اور اسے مومن بنائے بغیر نبوت و رسالت کا اہم ترین منصب کیونکر دیا جا سکتا ہے؟

سورۃ البقرہ میں ارشاد ہے۔

امن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمومنون کل امن باللہ و ملئکتہ و کتبہ ورسلہ (آیت ۲۸۵)

ان رسول کی طرف جو کچھ ان کے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے اس پر یہ رسول خود بھی ایمان لائے ہیں۔ اور سارے مومنین بھی اور سب کے سب (یہ رسول بھی اور مومنین بھی) اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہیں، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔(۲ : ۲۸۵)

تو مومنین ان رسول کی بعثت کے بعد ان کی تبلیغ و تعلیم سے ایمان لائے۔ رسول خود کب ایمان لائے۔ **یقیناً**" جس طرح حضرت موسیٰ جب وادی مقدس "طوی" میں وارد ہوئے تو سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنا تعارف کرایا اور یہ بتایا کہ وہ کس ہستی سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل کررہے ہیں (**انی انا ربک ۲۰ : ۱۲**) اس کے بعد ان کو منصب نبوت و رسالت سے سرفراز فرمانے کی خبر دی۔ (**وانا اخترتک ۲۰ : ۱۳**) پھر (**انی انا اللہ لا الہ الا انا ۲۰ : ۱۴**) (میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی الہ نہیں) ارشاد فرما کر گویا توحید کی تلقین فرمائی گئی۔ اس کے بعد ہی حکم ہوا کہ (**فاعبدنی واقم الصلوۃ لذکری۔ ۲۰ : ۱۴**) (تو میری عبادت کا حق بندے بن رہ کر ادا کر اور صلوۃ کی پابندی مجھ کو یاد رکھنے کے لئے قائم رکھ) اسی طرح یقیناً" حضرت جبریل نے بھی پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا تعارف کرایا ہوگا، پھر حضرت جبریل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایمان کی وحی زبانی کی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے اول المومنین ہو چکے تو اس کے بعد اسی موقع پر بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ساتھ سورہ فاتحہ کی وحی حضرت جبریل نے پیش کی۔ اس میں **ایاک نعبد وایاک نستعین** کے اقرار نے حضور صلی علیہ وسلم کو اول المسلمین بھی بنا دیا پھر اس کے بعد اسی وقت بسم اللہ کے ساتھ سورہ **علق** کی آیتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھوائیں۔

سورہ علق کی ابتدائی آیتوں کے اول الوحی ہونے کی روایت پر تنقید

مگر بخاری کی ایک روایت میں مذکور ہے کہ غار حرا میں سب سے پہلے جو وحی قرآنی نازل ہوئی وہ سورہ **علق** کی ابتدائی پانچ آیات ہیں۔ نیز روایت میں پڑھوانے کی کیفیت یہ مذکور ہے کہ حضرت جبریل نے کہا کہ اقراء' جواب

میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ **ما انا بقاری** تو حضرت جبریل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے معانقہ کیا، پھر کہا کہ اقراء، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی جواب دیا۔ حضرت جبریل نے پھر معانقہ کیا اور اس کے بعد کہا، اقراء، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی جواب دیا۔ پھر تیسری بار انہوں نے معانقہ کیا اور کہا کہ اقراء، تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھ دیا۔ یہ روایت اور اس میں پڑھوانے کی جو کیفیت مذکور ہے دونوں محل تامل ہیں۔

اس کی ایک وجہ تو بالکل کھلی ہوئی ہے۔ کہ اگر حضرت جبریل صرف زبانی کہی ہوئی آیات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے دہروا دینا چاہتے تو صرف اقراء کہہ کر چپ نہ ہوجاتے، بلکہ اقراء کہتے ہی نہیں یوں کہتے **قل بسم اللہ الرحمن الرحیم اقراء باسم ربک الذی خلق.....**

دوسرے یہ کہ کسی ان پڑھ کے سامنے کتاب پڑھنے کے لئے پیش کی جائے، جبھی وہ کہے گا کہ **ما انا بقاری** (میں پڑھنے کی صلاحیت والا نہیں ہوں) صرف زبانی سنی ہوئی بات کو اپنی زبان سے دہرا دینے میں کیا دشواری تھی کہ حضرت جبریل کو تین بار معانقہ کرنا پڑا۔ چار پانچ سال کے بچے کو مکتب میں بٹھانے کی رسم بہتوں نے دیکھی ہوگی۔ اس کے سامنے قرآنی آیات بولی جاتی ہیں اور وہ دہراتا جاتا ہے۔ غرض سنے ہوئے جملوں کو محض دہرانے کے لئے کہنے پر **ماانا بقاری** کا جواب بے معنی ٹھہرتا ہے اور دہرایا بھی تو تین بار معانقہ کے بعد، یہ اور بھی ناقابل فہم ہے۔ حضرت جبریل آیت سناتے جاتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زبان مبارک سے اس کو دہراتے جاتے۔ اس کے لئے تین تین بار معانقہ کی کیا ضرورت تھی۔ پھر جو حضرت جبریل پڑھتے، اسے سن کر اپنی زبان سے ادا کردینے کے لئے اگر حضرت جبریل نے اقراء کہا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے، **ما ذا اقراء** میں کیا پڑھوں؟

یہ گھتی نہایت آسانی سے سلجھ جاتی ہے۔ اگر دوسری کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے، چنانچہ دوسری کتابوں میں یہ فقرہ بھی اس حدیث میں موجود ہے کہ حضرت جبریل **جاء بکتاب فی نمط من دیباج** بعض میں ہے کہ **جاء بنمط**

من دیباج فیہ کتاب یعنی جبریل ایک ریشمی رومال میں ایک کتاب لائے تھے۔ (اس کا ذکر علامہ ابن حجر عسقلانی نے بھی اپنی کتاب فتح الباری شرح بخاری کی کتاب التفسیر کے باب سورہ **اقراء باسم ربک الذی خلق** میں کیا ہے) اور اس کتاب کو پیش کرکے حضرت جبریلؑ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اقراء (پڑھئے) اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب میں **ماانا بقاری** فرمانا صحیح ہوتا ہے یعنی میں پڑھنے والا نہیں ہوں۔ مگر معانقہ جبریل کے بعد اللہ تعالی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں پڑھنے کی صلاحیت پیدا کردی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا پڑھ دیا جتنا پڑھنے کے لئے کہا گیا اور وہ سورہ **علق** کی ابتدائی پانچ آیات تھیں۔

رہی بخاری میں مذکور اس روایت کی روایتی حیثیت تو اس پر تفصیل سے سیر حاصل بحث کا یہ موقع نہیں۔ اس لئے یہاں مختصر طور پر صرف اسی قدر لکھنے پر اکتفا کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے یہ روایت صحیح بخاری کے باب "کیف کان بدؤالوحی" میں مذکور ہے۔ ا.ر ابن شہاب زہری اس کی روایت عروۃ ابن زبیرؓ سے کرتے ہیں۔ اور عروۃ بن زبیرؓ سے زہری کا سماع حدیث ثابت نہیں ہے۔ ابن حجر عسقلانی تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۵۰ میں لکھتے ہیں۔ کہ

"**ولکن لا یثبت لہ السماع من عروۃ**" عروہ سے زہری کا سماع حدیث ثابت نہیں ہے۔

عروۃ بن زبیرؓ کی وفات سنہ ۹۹ھ میں ہے اور ابن شہاب زہری نے سنہ ۱۰۲ھ سے جمع حدیث کا کام شروع کیا ہے، اس لئے متقدمین نے تو لکھ دیا کہ عروۃ سے ابن شہاب کا سماع حدیث ثابت نہیں ہے۔ مگر متاخرین نے دیکھا کہ بخاری و مسلم وغیرہ سب میں زہری کی روایتیں عروۃ سے بلا واسطہ بہت ہیں اس لئے متاخرین محدثین نے اس پر اتفاق کرلیا کہ عروۃ سے ابن شہاب نے ضرور حدیث سنی ہے۔ پھر یہ عجیب بات ہے کہ ایسی مرسل حدیثیں جو ابن شہاب زہری روایت کریں ان کے متعلق اسی تہذیب التہذیب کی اسی جلد کے ص ۴۵۱ میں **بمنزلت الریح** (ہوائی) لکھا ہے۔ اور ابن شہاب کی عادت

یہ بھی تھی کہ حدیث میں اپنی طرف سے کچھ باتیں ملا کر روایت کرجاتے۔ کتاب المعتصر من المختصر اول کتاب الحج ص ۱۲۵ میں ہے کہ :۔

کان الذھری یخلط کلامہ بالحدیث ولذلک قال موسی بن عقبۃ افصل کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کلامک ولعلہ ضیع ماجمع من احادیث الزھری لذالک

یعنی' زہری حدیث میں اپنا کلام بھی ملا دیا کرتے تھے۔ اور اسی لئے موسی بن عقبہ نے زہری سے کہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سے اپنے کلام کو الگ رکھا کرو' اور شاید اسی لئے جتنی حدیثیں انہوں نے زہری سے سنی تھیں' سب کو ضائع کردیا اور اسی لئے اسمعیلی نے لکھا ہے کہ موسی بن عقبہ نے ابن شہاب سے کچھ نہیں سنا۔ سنا تو بہت کچھ' جمع بھی کیا' مگر سب کو ضائع کردیا۔ غرض ابن شہاب سے مروی حدیثوں کو روایت و درایت کی کسوٹی پر جانچ لینا ضروری ہے چاہے وہ بخاری و مسلم میں ہوں یا موطا میں۔ تو ایک تو ابن شہاب زہری کی خلط ملط کی عادت' اس پر ایسے شخص سے ان کا روایت بلاواسطہ کرنا جس سے ان کا سماع حدیث ثابت نہیں۔ پھر ان کی مرسل روایت کا بمنزلہ الریح ہونا' تین تین خصوصیتیں بخاری کی اس روایت میں ازروئے اصول روایت مانع قبول ہیں۔ لہذا محض بخاری میں اس روایت کا مذکور ہونا صحت کی ضمانت نہیں ہوسکتا۔

اب آگے بڑھئے اسی روایت میں مذکور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوہ حرا سے نہایت خوف کے عالم میں گھبرائے ہوئے گھر آتے ہیں اور آتے ہی حضرت خدیجہؓ سے فرماتے ہیں کہ زملونی زملونی (مجھ کو اڑھاؤ' مجھ کو اڑھاؤ) اور اپنی جان کے لئے خطرہ ظاہر کرتے ہیں۔ حضرت خدیجہؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی و تسکین دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے چچیرے بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں' جو عیسائی تھا' تورات و انجیل کا ماہر' عبرانی زبان کا ماہر' اور عربی زبان تو اس کی مادری زبان تھی' قریشی ہی تو تھا۔ اس کی تسلی و تسکین سے کسی قدر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان ہوا۔ اور اسی ورقہ نے جبریل کا تعارف حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے

کرایا۔ (خود جبریل نے اپنا تعارف مطلقاً" نہیں کرایا تھا) اور پھر روایت کے آخر میں ٹیپ کا یہ بند نہایت معنی خیز رکھا گیا کہ :۔

ثم لم ینشب ورقۃ ان توفی وفتر الوحی۔

یعنی پھر ورقہ زیادہ دن زندہ نہ رہے اور وفات پاگئے۔ اور وحی موقوف ہوگئی' کیا سمجھے؟ غور کیجئے! ورقہ سے حضرت خدیجہؓ کی قرابت' پھر ورقہ تورات و انجیل کے ماہر' عبرانی زبان کے ماہر' قریشی خاندان کے .... کیا یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ ورقہ سے استفادہ کیا گیا ہو۔ اور کیا جاتا ہو' آخر ورقہ کے مرتے ہی وحی کیوں رک گئی؟ جب تک کسی دوسرے مددگار کی تلاش رہی۔ جب دوسرا مل گیا تو پھر وحی آنے لگی۔ یہ روایت نہیں ہے' یہ دراصل سورہ نحل کی آیت ۱۰۳ کے کاٹ کے لئے ہے۔ مشرکین مکہ کے بارے میں مذکورہ سورہ کی مذکورہ آیت میں ہے کہ :۔

ولقد نعلم انھم یقولون انما یعلمہ بشر ط لسان الذی یلحدون الیہ اعجمی وھذا لسان عربی مبین۔ (سورہ نحل آیت ۱۰۳)

یعنی' "ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ایک شخص ان کو سکھاتا رہتا ہے۔ یہ لوگ جس کی طرف گمان کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے اور یہ صاف ستھری عربی زبان ہے۔" (۱۶ : ۱۰۳) اس کے جواب کے لئے ورقہ خاص قریشی' تورات و انجیل اور زبان عبرانی کا ماہر تیار کیا گیا ہے۔ اور حضرت خدیجہؓ کا چچیرا بھائی بھی تھا۔ اس لئے تعلقات کا رشتہ بھی واضح کردیا گیا اگر واقعی حضرت خدیجہؓ اپنے اس چچیرے بھائی قریشی خاندان کے فرد' تورات و انجیل اور عبرانی زبان کے ماہر (ورقہ بن نوفل) کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لے گئی ہوتیں اور اس نے یہ سب کچھ کہا ہوتا اور اس کے انتقال کرتے ہی وحی موقوف ہوجاتی تو مشرکین مکہ اس سے ناواقف نہ ہوتے وہ کسی کے عجمی یہودی غلام کی طرف کیوں گمان کرتے' ورقہ ہی کے نام کو خوب اچھالتے اسی آیت کے کاٹ کے لئے ورقہ بن نوفل کی شخصیت سامنے لائی گئی اور آغاز وحی کی روایت بنا کر اس میں ورقہ کا حصہ جوڑا گیا' اور آخر میں ٹیپ کا بند رکھا گیا کہ ورقہ کا ادھر انتقال ہوا اور ادھر وحی

رک گئی۔ پھر جب ایک یہودی غلام مل گیا۔ تورات و انجیل کا ماہر تو اس کی
امداد حاصل کی گئی اور پھر وحی آنے لگی فحوائے روایت کو گہری نظر سے
دیکھئے اس روایت کا خود ساختہ ہونا اور اس کے پس پردہ اس مقصد کا
کارفرما ہونا سب کچھ عیاں ہوتا چلا جائے گا لہٰذا آغاز وحی کے سلسلے میں صحیح
صورت حال وہی بنتی ہے جس کا تذکرہ پہلے کیا گیا۔ یعنی
غار حرا میں حضرت جبرئیل آئے۔
آکر انہوں نے پہلے اپنا تعارف کرایا' پھر
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین ایمان کی وحی زبانی (غیر متلو) کی۔
پھر بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ساتھ سورہ فاتحہ کی وحی قرآنی پیش کی۔
پھر وہیں عملاً" طریقہ صلوۃ سکھایا۔
پھر اسی موقع پر بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ساتھ سورہ علق کی ابتدائی
پانچ آیات اس کتاب میں سے پڑھوائیں جو ایک ریشمی رومال میں لائے
تھے۔

صلاحیت قرأت و کتابت

سورہ علق کی وہ پانچ آیتیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کتاب میں
سے پڑھوائیں گئیں وہ یہ ہیں :۔
— **اقراء باسم ربک الذی خلق ○ خلق الانسان من علق ○ اقرا وربک
الاکرم ○ الذی علم بالقلم ○ علم الانسان مالم یعلم ○** (سورۃ العلق آیت ا
تا ۵)
پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے عالم کو پیدا کیا۔ جس نے انسان کو
خون کی پھٹکی سے بنایا۔ پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے
ذریعہ سے علم سکھایا۔ اور انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ (۹۶: ۱ تا
۵)
بسم اللہ ہر سورہ کے شروع میں حضرت جبرئیل لاتے رہے (سورہ توبہ کے

سوا) مگر کسی سورۃ کا یہ جزو نہیں ہے۔ سورہ فاتحہ کا بھی جزو نہیں۔ دوسری
سورتوں کی طرح سورہ فاتحہ کے شروع میں بھی یہ ایک جملہ متانفہ ہے جو ہر
سورت کے پہلے رکھا گیا ہے۔
← اقراء جس کے حکم سے اس سورۃ کی ابتداء ہے اس حکم کی تعمیل کی
صلاحیت آپؐ میں نہ تھی حکم الٰہی کے مطابق حضرت جبرئیل نے حضور صلی اللہ
علیہ وسلم سے تین بار معانقہ کیا' اس طرح انہوں نے بذریعہ وحی آپ صلی
اللہ علیہ وسلم میں پڑھنے کی صلاحیت پیدا کردی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم
نے پڑھ کر اس حکم کی تعمیل فرمائی اور اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم قاری
یعنی پڑھنے کی صلاحیت والے ہوگئے اور یقیناً" دوسرے پڑھنے والوں سے آپ
صلی اللہ علیہ وسلم کی صلاحیت زیادہ ہی ہوگی۔ کم نہ ہوگی۔ خصوصی تعلیم کو
عام تعلیم سے بہتر ہی ہونا چاہئے۔
چوتھی آیت ہے "**الذی علم بالقلم**" تمہارا رب بزرگ وہ ہے جس نے
قلم کے ذریعہ تعلیم دی۔ "**علم الانسان مالم یعلم**" اس انسان کو ان باتوں
کی تعلیم فرمائی جن کو وہ جانتا نہ تھا (بلکہ جان ہی نہیں سکتا تھا)
اگر الانسان پر الف لام عہد کا نہ مانا جائے جنس ہی کا مانا جائے اور
نوع انسان مراد لی جائے جب بھی یہ سوال ہوتا ہے کہ اگر دوسروں کو قلم
کے ذریعے ایسی باتوں کی تعلیم فرمائی گئی جن کو وہ قلم کے ذریعے تعلیم حاصل
کئے بغیر جان نہیں سکتے اور اپنے رسول ہی کو قلم کے ذریعہ تعلیم نہیں فرمائی تو
وہ باتیں جن کا علم بغیر تعلیم بالقلم کے حاصل نہیں ہوسکتا۔ ان باتوں کے علم
سے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں محروم رکھا؟ اپنے رسول صلی اللہ
علیہ وسلم کو تو دوسروں سے زیادہ علم سکھانے کی ضرورت تھی۔ اس لئے
یقیناً" حضرت جبرئیل قلم بھی ساتھ لائے تھے۔ اور "رق منشور" (پھیلا کر خشک
کی ہوئی جھلی جو کاغذ کی طرح لکھنے کے لئے بنائی جاتی تھی۔) اس کا ایک ورق
بھی ساتھ لائے تھے۔ اور جو کچھ حضورؐ سے پڑھوایا تھا۔ اس کو حضور صلی
اللہ علیہ وسلم سے اس رق منشور پر لکھوا بھی لیا تھا۔ ورنہ یہاں قلم سے
لکھوانے کا ذکر کیوں فرمایا گیا۔

ان پانچ آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنے دو احسانوں کا ذکر فرمایا ہے۔ پہلے تخلیق کا ذکر فرمایا جس کے ساتھ ربوبیت کا ذکر بھی ضروری تھا کیوں کہ صرف تخلیق بغیر ربوبیت کے تو بے سود ہے۔ پیدا کرکے مخلوق کی پرورش و پرداخت اور اسے پروان چڑھائے بغیر تخلیق کا کوئی فائدہ مرتب نہ ہوگا۔ اس احسان کے احسانمند جس طرح ساری مخلوقات ہے۔ رسول بھی ہیں بلکہ سب مخلوقات سے زیادہ اس لئے کہ رسول کی تخلیق منصب نبوت و رسالت کے لئے ہوئی جو تخلیق کا اعلیٰ ترین مقصد ہے۔ خصوصاً " یہ آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم جن کی تخلیق ہی رحمت للعلمین کی حیثیت سے ہوئی ہے۔ اور کافتہ للناس یعنی پورے عالم انسانیت کے لئے بشیر و نذیر بنانے کے لئے پیدا کئے گئے۔

دوسرا احسان تعلیم بالقلم' یہاں ذکر فرمایا گیا کیا یہ ممکن ہے کہ اس احسان میں رسول کا کچھ حصہ نہ ہو اور رسول ہی سے کہا جائے کہ پڑھو اور میرے اس احسان کو یاد کرو جو پورے بنی نوع انسان پر ہم نے کیا ہے۔ مگر تم کو اس سے محروم رکھا ہے۔ یہ بالکل غیر ممکن ہے۔ یقیناً " جس طرح حضرت جبریل کے ذریعے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کتاب بھیج کر پڑھنے کی تعلیم آپ' کو دی گئی اسی طرح قلم بھی بھیج کر قلم کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھنے کی بھی ضرور تعلیم وحی جبریل کے ذریعہ اسی دن اسی وقت اسی کوہ حرا پر دی گئی۔

قرآنی شہادت

میرے اس دعوی کی شہادت کسی روایت سے نہیں ملتی اور درایت سے جو استدلال میں نے کیا ہے۔ اہل انصاف و دیانت تو ضرور تسلیم کریں گے۔ مگر روایت پرست کبھی نہ مانیں گے۔ تو میں قرآن مبین کا بیان واضح اور صریح الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔ **وکفی باللہ شہیدا**

اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو مخاطب کرکے فرماتا :۔

وما کنت تتلو من قبلہ من کتاب ولا تخطہ بیمینک اذا لارتاب المبطلون
(عنکبوت آیت ۴۸)

"اور تم (اے رسول) اس (قرآن کے نزول) سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ سکتے تھے۔ (ورنہ) اس وقت یہ باطل پرست لوگ بہت شک شبہے پیش کرتے رہتے۔"

بیشک آپ' پہلے سے لکھے پڑھے نہ تھے۔ مگر بعثت کے وقت آپ' کو لکھنے پڑھنے دونوں کی صلاحیت بدرجہ اتم عطا فرمادی گئیں ورنہ اس آیت میں "من قبلہ" کا فقرہ نہ ہوتا۔ یہ "من قبلہ" صاف بتا رہا ہے کہ من بعدہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں ضرور لکھنے پڑھنے کی صلاحیت آگئی تھی۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو النبی الامی اور بعث فی الامیین رسولا " جو فرمایا گیا ہے بالکل صحیح فرمایا گیا ہے مگر عجمی منافقین نے من گھڑت روایات کے ذریعے امی کے معنی "ان پڑھ" (لکھنے پڑھنے سے عاری) مشہور کیا ہے۔ قرآن مبین نے اس کو بھی بتا دیا ہے کہ دو قومیں عرب میں تھیں۔ ایک تو اہل کتاب تھے جو کسی آسمانی کتاب سے اپنے دین کو منسوب کرتے تھے۔ دوسرے جن کے پاس کوئی کتاب نہ تھی۔

ومنھم امیون لا یعلمون الکتاب الا امانی وان ھم الا یظنون۔
(سورۃ البقرہ آیت ۷۸)

"اور ان مخالفوں میں سے امی لوگ بھی ہیں جو کتاب وتاب تو نہیں جانتے بجز وہمی امیدوں کے اور انکل پچو گمانوں کے اور کچھ نہیں جانتے' اوہام ہی سے کام لیا کرتے ہیں۔"

یعنی غیر اہل کتاب کو امی کہتے تھے جو کچھ ماں باپ سے سنا وہی ان کا دین تھا۔ مادر زاد دین پر تھے۔ اور ام القری یعنی مکہ مکرمہ کے رہنے والے کو بھی امی کہتے تھے۔

آل عمران کی بیسویں آیت میں ہے۔

قل للذین اوتوا الکتاب والامیین..... الایتہ

"اہل کتاب اور امیوں سے کہو' دو قومیں تھیں اس لئے فرمایا گیا کہ اہل

کتاب اور امیوں سے کہو اگر غیر اہل کتاب جن سے مکہ آباد تھا، یہ سب
ان پڑھ اور جاہل ہی تھے تو جاہلیت کے شعراء سو سو شعر کے قصائد لکھ لکھ کر
خانہ کعبہ پر کس کے پڑھنے کے لئے آویزاں کرتے تھے۔ اور یہ شعراء جاہلیت
بھی تو امیون ہی میں سے تھے اپنے اشعار کس طرح لکھتے تھے۔ یہی مشرکین مکہ
جنگ بدر میں قید ہوئے تو ان کا فدیہ یہ قرار دیا گیا کہ ہر قیدی مدینہ کے دس
دس لڑکوں کو کتابت سکھائے اور تھے چند جنہوں نے نقد فدیہ ادا کیا تھا ان
کے سوا زیادہ قیدیوں نے دس دس مدنی لڑکوں کو کتابت سکھا کر رہائی حاصل کی
تھی، پھر بھی سارے اہل مکہ امی، ان پڑھ (لکھنے پڑھنے سے عاری) ہی مشہور
کئے جاتے ہیں۔

اہل مدینہ بھی لکھے پڑھے تھے۔

بعض کوتاہ نظر سیرت نگاروں نے لکھدیا ہے کہ جنگ بدر کے قیدیوں نے
اہل مدینہ کو لکھنا پڑھنا سکھایا تو مدینے میں لکھے پڑھے لوگ تیار ہوگئے۔ یہ
ان کی ناواقفیت کی دلیل ہے مدینے میں ہجرت نبوی سے پہلے بہت لوگ لکھنا
پڑھنا جانتے تھے۔ میں نے کتاب جمع قرآن میں متعدد اہل مدینہ کے نام لکھ
دیئے ہیں۔ جو ہجرت نبوی سے پہلے اسلام قبول کرنے سے قبل کے لکھے پڑھے
تھے۔ مگر اہل مکہ و اہل مدینہ دونوں کی رسم خط میں کچھ اختلاف تھا۔ اگر
اہل مدینہ سے کہا جاتا کہ تم اہل مکہ کی رسم خط اختیار کرو تو یہ ان پر جبر
ہوتا۔ اور دشوار بھی ہوتا۔ اور مکی قیدیوں نے جو دس دس مدنی لڑکوں کو
کتابت کی تعلیم کردی تو ستر قیدی تھے جن میں سے تقریباً" بیس قیدیوں نے فدیہ
ادا کرکے رہائی حاصل کی تھی پچاس قیدیوں نے دس دس مدنی لڑکوں کو
کتابت سکھائی۔ (یہ تخمینہ قیاسی ہے۔ اس میں کمی بیشی کا امکان ضرور
ہے۔) غرض اس تخمین کو مان لیجئے۔ تو پانچ سو مدنی لڑکے مکی رسم الخط کے ماہر
مدینے میں باسانی تیار ہوگئے۔ اب اہل مکہ و اہل مدینہ کے مصاحف میں رسم
خط کے اختلاف کے وقوع کا خطرہ باقی نہ رہا۔ یہ مصلحت تھی مکی قیدیوں سے

مدنی لڑکوں کو کتابت کی تعلیم دلوانے کی۔

روایات کو پرکھنے کا معیار

حاصل کلام یہ ہے کہ سیرت نبوی اور سیر مہاجرین و انصار و عامہ صحابہؓ
اور وقائع عہد نبوی کے متعلق خصوصاً" اور وقائع عہد خلفائے راشدین و
عہد صحابہؓ و اکابر تابعین کے لئے عموماً" صدق و کذب معلوم کرنے کے لئے
اور اصل حقیقت کا پتہ لگانے کے لئے صحیح ترمعیار درایت قرآنیہ ہے۔ کتب
حدیث اور کتب سیر کی روایات "و لیکن قلم درکف دشمن است" کے مطابق
بعض واہی رواۃ کے تصرفات سے ہرگز محفوظ نہیں۔ ایسی کتنی جھوٹی اور
بالکل جھوٹی باتیں روایات کے ذریعہ کتابوں میں مذکور ہیں۔ جن کو درایت
قرآنیہ ہرگز قبول نہیں کرتی اور ایسی بھی بعض باتیں ہیں جن کے وقوع کی
شہادت قرآنی درایت دے رہی ہے۔ مگر اس کے متعلق کوئی روایت نہیں ملتی
اس لئے

کرتا ہے ہر خبر پہ تمنا یقین کیوں　　ناداں! نوید دوست فریب عدو نہ ہو

روایات کو سوچ سمجھ کر قبول کرنا چاہئے اور درایت قرآنیہ کا ہر موقع پر
پتہ لگانا ضروری ہے۔ کیونکہ اصل حقیقت کا پتہ قرآنی درایت ہی سے مل سکتا
ہے صرف روایت سے نہیں مل سکتا۔ مگر درایت قرآنیہ کا پتہ بھی خالی
الذہن ہوکر غلو و تعصب سے پاک ہوکر ہی لگایا جاسکتا ہے۔ پہلے ہی سے کوئی
رائے قائم کرکے درایت قرآنیہ کی تلاش سخت گمراہ کن ہے۔ ایسے مواقع
پر حقیقت میں بازپرس قیامت کو پیش نظر رکھنا ہر مومن کا فرض ہے۔

درایت قرآنیہ

اپنی خواہش نفس کی پیروی وقتی مصلحت بنی اور غیر اسلامی معاشرے کی

وجہ سے جو دشواریاں فی الحال پیدا ہو چکی ہیں یا مخالفین کی ہٹ دھرمی کے
اعتراضات کے باعث ان کے جواب دینے کے بجائے احکام صریحہ کی
تاویلات کی تلاش وغیرہا اس قسم کی باتیں دراصل درایت قرآنیہ کی تلاش
میں مستقل راہزن کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جب تک ایک ایسا شخص جو عربی
زبان پر پوری قدرت رکھتا ہو۔ علوم ادبیہ صرف و نحو اور علم معانی و بیان
سے پوری طرح واقف ہو۔ لغات و محاورات عرب سے آگاہ ہو اور باز پرس
آخرت کا درحقیقت اس کے دل میں خوف ہو۔ وہ بھی بالکل خالی الذہن ہو کر
جب تک کسی مسئلے کی درایت قرآنیہ کی تلاش نہ کرے گا کبھی صحیح نتیجے پر
نہیں پہنچ سکتا۔

ہے یہ وہ منزل کہ رہگیروں کو ملتا ہے جہاں
ہر قدم پر ایک خندق ہر قدم پر اک کنواں

روایات و اخبار

روایات سب کی سب جھوٹی نہیں اول درجے کا کذاب بھی کبھی سچ ضرور
بولتا ہے۔ بعض دفعہ سچی بات میں بھی جھوٹ کی کسی قدر آمیزش ہوتی ہے جس
کا پتہ درایت قرآنیہ ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔
قرآن مجید میں حکم ہے۔

ان جاء کم فاسق بنبا فتبینوا (الحجرات آیت ۶)

اگر کوئی فاسق شخص خبر لائے تو اس کی تحقیقات کرو۔ (۴۹:۶)
یہ نہیں فرمایا کہ چھوٹتے ہی اس کو جھٹلا دو' اس کی بات نہ مانو' اس کی
لائی ہوئی خبر کی پرواہ نہ کرو۔ یہ حکم تو دنیاوی امور' دشمن کے حملہ یا فراریا
صلح پر آمادگی وغیرہ باتوں کے متعلق ہے یہاں دینی احکام کی خبریں ہیں اور وہ
بھی رسولؐ کے قول و فعل کے متعلق' انہیں بلا تحقیق ماننے سے انکار تو کفر
ہے۔

لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی۔ (سورۃ الحجرات آیت ۲)

اے ایمان والو! نبی کی آواز پر اپنی آواز بلند مت کرو۔ (۴۹:۲)
ایسی کتابوں میں جن کو ایک ہزار برس سے ہمارے بزرگان اسلاف معتمد
علیہ سمجھتے چلے آرہے ہیں۔ اب اگر تحقیقات سے یہ پتہ لگ گیا ہے کہ یہ
کتابیں جس حد تک معتمد علیہ سمجھی جاتی ہیں اس حد تک معتمد علیہ نہیں ہیں۔
تو اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ ساری کی ساری کتب حدیث و سیر بالکل ہی
ناقابل اعتبار ہیں۔ جب بعض اقوال و افعال کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی طرف ان کتابوں میں ہو تو یہ ایک حیثیت سے صوت النبی ہی
ہے۔ جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت پر ایمان رکھتا
ہے۔ اس پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ اس بات کی تلاش کرے کہ آنحضرت صلی
اللہ علیہ وسلم نے ہماری ہدایت اور نجات کے لئے کیا کچھ تعلیم دی ہے۔
اور کیا کچھ عمل کرکے دکھایا ہے پھر وہ اپنی صلاحیت کے مطابق خدا ترسی
اور امانت و دیانت کے ساتھ یہ بھی تحقیق کرے کہ واقعی یہ قول یا فعل
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے یا نہیں؟ روایت صحیح ہے یا غلط یہ حق تو
کسی مسلمان کو حاصل نہیں کہ وہ تحقیق کی ضرورت ہی نہ سمجھے۔ اور سرے
سے ان روایات کی پرواہ ہی نہ کرے اس کے برخلاف اگر بغیر تحقیق کے یا
تحقیق کی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے (یا اپنی تحقیق کی رو سے) کسی (غلط)
روایت کا اتباع کرلیا یہ سمجھتے ہوئے کہ یہی ارشاد نبویؐ قولاً" یا عملاً" ہے۔
تو وہ مورد الزام نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ وہ اتباع رسول کی نیت رکھتا
ہے۔
مگر جو شخص بغیر تحقیق کے روایات کو ماننے سے انکار کردیتا ہے اور
روایات کی مطلق پرواہ نہیں کرتا وہ درحقیقت رسولؐ کی رسالت کا منکر
ہے۔ میری ایک رباعی ہے۔

چارہ نہیں ہرچند روایت کے بغیر — مانو نہ روایت کو درایت کے بغیر
تقلید ہے رات اور تحقیق ہے شمع — شب کو نہ چلو شمع ہدایت کے بغیر

ائمہ مجتہدین میں سے کسی کی تقلید نہ کرنا اور امام بخاری و امام مسلم
وغیرہ کو معصوم سمجھ لینا اور روایان حدیث کو جبرئیل امین قرار دے دینا تو

بدترین تقلید ہے۔

میں امام ابو حنیفہ کی تقلید تو نہیں کرتا مگر اتباع کو روایات پر بغیر تحقیق کئے عمل کرنے سے ہزار گنا بہتر سمجھتا ہوں۔

صرف قرآن مجید

جو لوگ روایات اور فقہی مسائل سب کا مطلقاً" انکار کرکے صرف قرآن مجید سے بطور خود مسائل نکالتے ہیں۔ باوجود یہ کہ وہ عربی زبان اور صرف و نحو اور معانی و بیان سے اتنے بھی واقف نہیں جتنے مدارس اسلامیہ کے نصف حد تک تعلیم یافتہ طلبہ واقف ہیں۔ وہ دراصل قرآن مجید کا اتباع نہیں کرتے۔ اپنے منشاء کا تابع قرآن مجید کو بناتے ہیں۔ انہوں نے روایات و فقہیات کا انکار اس لئے کیا ہے کہ کسی طرح کی پابندی ان پر عائد نہ ہو اور آزادانہ جو مفہوم چاہیں قرآنی آیات سے کھینچ تان کر نکالتے رہیں میں نہیں سمجھ سکتا کہ ان کا ایمان قیامت پر اور قیامت کے دن کے محاسبہ اعمال پر اور جزا و سزا پر واقعی ہے یا نہیں؟ میں دیکھتا ہوں کہ وہ **الذین ضل سعیھم فی الحیوۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا۔** (الکہف ۱۰۴)

(دنیا میں ان کی ساری کوشش ضائع ہو رہی ہے۔ حالانکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بہت اچھا کام کررہے ہیں(۱۸: ۱۰۴) کا مصداق ہیں۔ اور پورا پورا مصداق ان کے سامنے مفاد دنیوی کے سوا مفاد آخرت کبھی نہیں آتا۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں جو کچھ لکھتے ہیں صرف اپنے مفاد دنیوی کے لئے اور آخرت فراموشی کے الزام کے ڈر سے کبھی کبھی بے وزن الفاظ میں اوپری دل سے آخرت کا ذکر بھی کردیتے ہیں۔ درحقیقت آخرت پر ان کا صحیح معنوں میں ایمان ہی نہیں۔

اپنا تعارف:۔

میں نے اس بات کو قدرے طویل اس لئے لکھا ہے کہ اس سے مقصود اپنا تعارف بھی ہے۔ تاکہ مجھ کو ناظرین صحیح طور پر جان لیں کہ میں کیا ہوں۔

میں ائمہ مجتہدین میں سے امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ کو سب سے بہتر سمجھتا ہوں۔ جس مسئلے میں تحقیق کا موقع نہیں ملا ہے۔ اس میں ان کے مسلک کا اتباع کرتا ہوں۔ اتباع سبیل المومنین کو فرض عین سمجھتا ہوں۔ سبیل المومنین ہی کا دوسرا نام "سنت" ہے۔

میں صحیح حدیثوں کو دین میں حجت سمجھتا ہوں۔ اور صحیح حدیثوں کی مخالفت کو بدترین گمراہی جانتا ہوں۔ اللہ تعالی نے اپنے فضل و کرم سے اتنی صلاحیت دی ہے کہ صحیح و غلط حدیث کو درایت قرآنیہ سے پرکھ لوں۔ عربی علوم ادبیہ سے بفضلہ تعالی واقف ہوں۔ عربی نظم و نثر لکھنے کی قدرت اللہ تعالی نے دی ہے۔ عربی صرف و نحو پر میری تصنیفیں ہیں۔

غرض قرآن مجید کو سمجھ لینے کی صلاحیت اللہ تعالی نے دی ہے۔ قیامت کی بازپرس سے بہت ڈرتا ہوں جانتا ہوں کہ میری اس تصنیف سے کوئی بھی خوش نہ ہوگا۔ ہر فرقے کو اس سے اختلاف کم و بیش ضرور ہوگا۔ مگر جو حق سمجھتا ہوں وہی لکھتا ہوں کوئی خوش ہو یا ناخوش مجھے کسی کی پرواہ نہیں اللہ تعالی میری نیت خوب جانتا ہے کہ میں عام مسلمانوں کو موجودہ گمراہ کن مدعیان رہبری (منکرین حدیث) کے فریب سے بچانے کے لئے یہ لکھ رہا ہوں۔ اس کے سوا میری کوئی غرض نہیں۔ **وکفی باللہ شھید وھو رجی یعلم سری وعلانیتی۔**

آمدم برسر مطلب:۔

میرے سابق بیانات سے ناظرین اتنا ضرور سمجھ گئے ہوں گے کہ کوہ حرا پر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت جبرئیل علیہ السلام جب ملے تو سب سے پہلی وحی انہوں نے تلقین ایمان کی پیش کی۔ جو قرآنی آیت کی صورت میں نہ تھی بلکہ غیر قرآنی وحی تھی۔ اس لئے کہ قرآنی وحی تو نبوت ملنے کے وقت ہی پیش کی جا سکتی تھی۔ نبوت سے پہلے آپ کا مومن ہونا ضروری تھی۔ اس لئے تلقین ایمان کی وحی چونکہ آپ کو اول المومنین بنانے کے لئے تھی۔ اس کے بعد ہی آپ نبی ہوسکتے تھے۔ اس لئے حضرت جبرئیل نے بحکم رب العلمین آپ کو تلقین ایمان کی۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خلعت نبوت عطا کرتے ہوئے پہلی وحی قرآنی بسم اللہ الرحمن الرحیم کی اور دوسری سورہ فاتحہ کی ہوئی۔ جس کو عام وحی کے اعتبار سے دوسری اور تیسری وحی سمجھئے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ الحمد للہ رب العلمین کو اگرچہ اول وحی قرآنی عام محدثین و اہل سیر نہیں لکھتے ہیں۔ مگر اس کی بعض روایتیں تفسیر ابن کثیر وغیرہ میں ہیں[1]۔ مگر روایتی ضعف سے نفس حدیث جو درایتہً صحیح ہو ضعیف نہیں ہو سکتی۔

چوتھی وحی قرآنی :۔

چوتھی وحی سورہ علق کی پہلی پانچ آیتوں کی ہوئی۔ اس وحی کی غرض آپ کو لکھنے پڑھنے کی صلاحیت والا بنا دینا تھی۔ جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

---

[1] علامہ ابن حجر عسقلانی نے بھی اپنی کتاب فتح الباری شرح بخاری کی کتاب التفسیر کے باب سورہ اقراء باسم ربک الذی خلق میں لکھا ہے کہ ابو میسرۃ کی روایت کی رو سے سب سے پہلے حضرت جبرئیل جو وحی قرآنی لائے وہ بسم اللہ الرحمن الرحیم الحمد للہ رب العلمین.... ہے اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ھو مرسل وان کان رجالہ ثقات (یہ روایت مرسل ہے۔ اگرچہ اس کے رواۃ ثقہ ہیں) اگر راویوں کے ثقہ ہونے کے باوجود محض اس کا مرسل ہونا اسے ساقط الاعتبار قرار دینے کے لئے کافی ہے تو سورہ علق کی ابتدائی آیتوں کی جو روایت زہری سے ہے اس میں تو جیسا کہ پہلے دکھایا جا چکا ہے مرسل ہونے کے ساتھ ساتھ مزید دو خامیاں ہیں پھر اسے ساقط الاعتبار کیوں نہیں کہا جا سکتا؟۔

پانچویں وحی :۔

پانچویں غیر قرآنی وحی کے ذریعہ آپ کو تعلیم قرأت دی یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں بالفعل پڑھنے کی صلاحیت پیدا کردی۔

چھٹی وحی (غیر قرآنی)

بذریعہ قلم آپ میں لکھنے کی صلاحیت پیدا کردی۔ ان چھ وحیوں کا حال آپ کو معلوم ہوچکا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اول المومنین ہوجانے کی نوعیت کو بھی آپ سمجھ گئے ہیں۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اول المسلمین ہونے کی کیفیت بھی معلوم کرلیجئے۔ جس کا شرف آپ کو چھٹی وحی کی ذریعہ اسی وقت اسی کوہ حرا پر ہوا تھا۔ پانچویں اور چھٹی وحی غیر قرآنی تعلیمی وحی تھی۔ جبرئیل کا معانقہ یا قلم کا ہاتھ میں دے دینا ظاہری اسباب تھے۔

ساتویں وحی :۔ (غیر قرآنی)

ساتویں وحی کے ذریعہ آپ کو نماز سکھائی گئی۔ سورہ فاتحہ کی وحی جب آپ کو ملی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ فاتحہ پڑھی تو اس میں اقرار کیا۔ **ایاک نعبد وایاک نستعین۔** بیشک ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔

ضرورت باقی رہ گئی تھی کہ اس اقرار زبانی کا عملی ثبوت کس طرح دیا جائے؟ یہ بھی آپ کو بتادیا جائے کہ عبادت تو دل کرتا ہے، مگر اس کی ترجمانی اعضاء و جوارح کرتے ہیں اور زبان کرتی ہے۔

حضرت موسیٰ علی نبینا و علیہ السلام کو بھی تلقین ایمان کے بعد اقامت صلوۃ کا حکم ہوا تھا تو ضرور نماز پڑھنے کا طریقہ بھی بتادیا ہوگا۔ جب تک طریقہ صلوۃ حضرت موسیٰ کو بھی بتایا نہ گیا ہوا اقامت انہوں نے کس طرح کی ہوگی، اس لئے اسی طرح حضرت جبرئیل نے حضور علیہ السلام کو نماز پڑھنے کے طریقے کی وحی پیش کی۔ اور نماز پڑھنے کا طریقہ بتایا۔ اور نماز پڑھ کر بھی دکھلا دیا۔ اس کے بعد چوتھی وحی قرآنی پیش کی۔

آٹھویں وحی چوتھی وحی قرآنی

آٹھویں وحی جو چوتھی قرآنی وحی ہے میں یہ آیت اتری

اتل ما اوحی الیک من الکتاب واقم الصلوۃ ان الصلوۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر ولذکر اللہ اکبر واللہ یعلم ما تصنعون۔ (العنکبوت آیت ۴۵)

"اس کتاب سے جو آپؐ کی طرف وحی کی گئی ہے اس کی تلاوت کیا کرو اور (جو نماز ابھی سکھائی گئی ہے) اس نماز کی پابندی قائم رکھو۔ بلاشبہ نماز بے حیائی کی باتوں اور ناپسندیدہ کاموں سے (انسان کو) روک دیتی ہے اور اللہ کا ذکر ضرور بہت بڑا "سہارا" ہے"۔ (۲۹:۴۵)

اس آیت میں الکتاب پر الف لام عہد کا ہے۔ یعنی جو کتاب تمہارے سامنے پیش کی گئی جس میں سے تمہیں پڑھوایا گیا اور جو ابھی تمہارے سامنے رکھی ہے اس کتاب سے جو وحی آپؐ کو ملی ہے۔ اس کی تلاوت کیا کرو۔ یہ کتاب کی قید اس لئے لگادی گئی کہ اس کتاب سے باہر بھی وحی اس وقت آپؐ کو ملی تھی جو سب سے پہلے تلقین ایمان کی وحی تھی۔ اور پھر کتاب پڑھوانے کے وقت کئی بار حضرت جبریل نے اقراء اقراء کہا۔ پھر کتابت سکھلانے کے وقت جو کچھ کہا پھر نماز پڑھنے کا طریقہ بتانے کے وقت جو کچھ حضرت جبریل حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے لفظوں میں کہتے گئے وہ سب بھی بحکم رب العلمین تھے۔ اور وہ وحی ہی کی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر حضرت جبریل جو کتاب لائے تھے۔ (یعنی قرآن مجید) اس کتاب سے نہ تھی۔ اس لئے کہ کہیں ان کی تلاوت بھی ضروری نہ سمجھی جائے۔ لہٰذا یہاں "من الکتاب" کی قید لگادی۔ یہ قید اس کی دلیل ہے کہ بعض غیر قرآنی وحی بھی آپؐ کے پاس وہاں نازل ہوئی تھیں اور نازل ہوتی رہتی تھیں مگر وہ تابع ہوتی تھیں قرآنی وحی کے، اس لئے اس کی حفاظت کا حکم نہ ہوا۔ اور نہ ان کو محفوظ رکھنے کی ضرورت تھی۔ اس لئے کہ مفہوم کی حیثیت سے ان کا مفہوم قرآنی آیات میں موجود ہے۔ اور عمل کی حیثیت سے سبیل المومنین میں داخل تعامل ہے۔ اسی طرح اقم الصلوۃ کے حکم میں بھی الصلوۃ پر الف

لام عہد ہی کا ہے یعنی یہی نماز جس کا طریقہ تمہیں جبریل نے بتایا ہے اور خود پڑھ کر تمہیں دکھلادیا کہ اس طرح اس عبادت کو ادا کرنا چاہئے۔ اسی صلوۃ کی پابندی قائم رکھو۔

کسی حکم کا فائدہ بھی اگر مامور کو بتادیا جائے کہ اس حکم کے بجالانے سے تمہیں یہ فائدہ ہوگا تو فطرتاً" مامور اس حکم کو پوری تندہی اور دلی رغبت کے ساتھ سرانجام دے گا۔ اسی لئے اس صلوۃ کا فائدہ بھی بتلادیا گیا کہ نماز کی پابندی سے انسان بے حیائی کی باتوں اور ناپسندیدہ کاموں سے رکا رہتا ہے۔ نماز اس کو ایسی بری چیزوں سے روک دیتی ہے کیونکہ بندہ جب پابندی کے ساتھ اپنے رب اور اپنے مالک کے حضور میں حاضری دیا کرتا ہے اور جانتا ہے کہ میری کوئی بات میرے مالک سے چھپی نہیں رہ سکتی۔ وہ دل کی بات بھی جانتا ہے وہ ہر جگہ اور ہر وقت حاضر و ناظر ہے اور پھر مجھ کو بار بار اپنے سامنے اپنی اطاعت و فرمانبرداری کا ثبوت اس نماز کے ذریعہ برابر دیتا رہتا ہے۔ ایسا بندہ جانتے بوجھتے کوئی بے حیائی کی بات یا کوئی ایسا کام جس کو وہ جانتا ہے کہ یہ میرے مالک کو ناپسند ہے کیسے کرسکتا ہے؟ اگر بھول چوک سے یا نفس شیطان سے مغلوب ہوکر کوئی گناہ کرے گا تو یقیناً" اس کو اس کے بعد بڑا قلق ہوگا کہ اب کس منہ سے مالک کے سامنے حاضری دوں گا۔ قبل اس کے کہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو یقیناً" روئے گا، گڑگڑائے گا توبہ کرے گا، دعائے مغفرت کرے گا اس کے بعد نماز کے لئے کھڑا ہوگا۔ اور پوری کوشش کرے گا کہ پھر اس سے کسی طرح کی نافرمانی نہ ہو۔

تو خفا ہے یہی احساس ہے اک سخت عذاب
تیرے مجرم کو سزا اس کی خطا دیتی ہے

اس کے بعد فرمایا گیا و"لذکر اللہ اکبر" اللہ کا ذکر بہت بڑا ہے۔ اس جملے میں تمیز محذوف ہے۔ سورۃ السجدہ آیت ۱۶ میں مومنین کی شان یہ بتائی گئی ہے۔

یدعون ربھم خوفا وطمعا (سورۃ السجدہ آیت ۱۶)

وہ اپنے رب کو پکارتے ہیں، خوف کے وقت بھی اور امیدوں کے وقت بھی، ڈرتے ہوئے بھی اور آس لگائے ہوئے بھی۔ (۱۶:۳۲)

اور سورہ اعراف آیت ۵۶ میں تو صاف حکم ہے

وادعوہ خوف وطمعا۔ (سورۃ اعراف آیت ۵۶)

اللہ تعالیٰ کو پکارو (اس سے) ڈرتے ہوئے بھی اور اس سے امیدیں لگائے ہوئے بھی۔ (۵۶:۷)

یہاں وہی خوفا" وطمعا" تمیز محذوف ہے۔ قرآن مجید میں اس کی بہت سی مثالیں ملیں گی کہ اسم تفضیل کی تمیز محذوف کردی گئی جو قرینے سے سمجھی جاتی ہے جیسے **الفتنتہ اشد من القتل** یعنی اشد فساداً، نیز فرمایا "ادفع بلاتی ہی احسن"۔ یعنی احسن مدافعتہ" یا احسن تاثیرا" (ان کے علاوہ بہت سی مثالیں ملیں گی) اس طرح یہاں بھی خوفا" و **طمعا**" تمیز محذوف ہے حضرت جبریل نے نماز کے ہر رکن کی ابتدا جو اللہ اکبر سے بتائی اس کا ماخذ یہی آیت ہے اللہ اکبر یعنی اللہ اکبر خوفا" وطمعا"۔

آج سے تقریبا" ۴۵ برس قبل میں نے ایک کتاب نماز کے متعلق لکھی تھی اس میں اللہ اکبر کے معنی غیر عربی دانوں کو بتائے، سب سے بڑا سہارا (دنیا و آخرت میں دین کے لئے) اللہ تعالیٰ ہے۔ تو امیدیں ہی ہونی چاہئیں۔ خوف تو اس سے نہیں بلکہ اس کی نافرمانی سے ہے کہ اس کی نافرمانی مجھ سے کہیں نہ ہوجائے۔ صرف اس کا ڈر ہے پھر اگر نافرمانی ہو بھی جائے تو اس کی رحمت سے اس کی مغفرت کی امیدیں رہیں اور توبہ استغفار رہے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ اکبر کہنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اللہ اصغر بھی ہے حد درجے کا جاہل ہے عربی زبان کی ہوا بھی اس کو نہیں لگی ہے۔ **فسبح باسم ربک الاعلی** وہ پڑھتا ہے تو اس سے کسی "رب ادنی" کا خیال کیوں نہیں کرتا۔ **اقراء باسم ربک الاکرم** پڑھتا ہے تو کیا اس کے مقابل کوئی دوسرا رب کریم بھی ٹھہراتا ہے اور رب کریم اور رب اکرم دو رب مانتا ہے۔ اللہ اعلم حیث **یجعل** رسالتہ تو کیا (نعوذ باللہ) کوئی اللہ اجہل بھی ہے اس طرح کی جاہلانہ منطق کی زد تو ساری صفات الٰہی پر پڑتی ہے۔ یعنی ہر صفت کی

ضد پیش کرکے کہا جاسکتا ہے کہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اللہ ایسا بھی ہے **مثلا**" اللہ خالق کے بارے میں ایسے شخص کو کہنا چاہئے کہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اللہ مخلوق بھی ہے بلکہ ہر اس خبر کے بارے میں اسی طرح کی منطق جاری ہوسکتی ہے۔ جس خبر کا مبتدا لفظ اللہ ہے۔

نویں وحی سمت قبلہ :۔

غرض یہ سب سے پہلی آیت ہے جو حکم نماز کے متعلق اتری مگر نماز ہی سے متعلق یہ حکم تھا اور نماز پڑھنے کا طریقہ حضرت جبریل سے معلوم ہوچکا تھا تو اب تعمیل حکم میں دیر کیوں کی جاتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہیں کھڑے ہوکر نماز پڑھنے کا ارادہ کیا تو قبل اس کے کہ آپؐ تحریمہ باندھیں حضرت جبریل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی وحی اپنے لفظوں میں پہنچائی یعنی غیر قرآنی وحی پیش کی کہ رخ بیت المقدس کی طرف کرکے نماز پڑھئے اس کو قبلہ بنائیے تو حضرت جبریل کی بتائی ہوئی سمت کی طرف رخ کرکے آپؐ نے دو رکعت نماز پڑھی یہ نویں وحی اور پانچویں غیر قرآنی وحی ہوئی۔ اس کے بعد ایک اور غیر قرآنی وحی حضرت جبریل نے سنائی جو قطعی نہیں مگر اس کا غالب گمان ضرور ہے۔

کوہ حرا پر چلتے چلاتے آخری دسویں وحی :۔

جب آپؐ **خلعت** نبوت و رسالت سے سرفراز ہوچکے تو حضرت جبریل کا اپنے کام سے فارغ ہوکر حضور علیہ السلام سے رخصت ہونے کا وقت آیا تو گمان غالب یہ ہے کہ یہ وحی بھی حضرت جبریل نے رب العالمین عزوجل کی طرف سے ضرور پیش کردی ہوگی کہ ان واقعات اور ان وحیوں میں سے کسی چیز کو بھی صیغہ راز میں نہ رکھا جائے۔ اپنے گھر پہنچ کر گھر کے سب لوگوں کو مطلع کردیا جائے اور وہ لوگ بھی ان باتوں کو صیغہ راز میں نہ رکھیں اگر گھ

کے لوگوں سے سنگر باہر کا کوئی آدمی آکر حالات پوچھے تو بغیر کسی جھجک کے پورے حالات بیان کردینا اور اپنی نبوت و رسالت سے ہر پوچھنے والے کو مطلع کردینا اور نماز کی پابندی کو قائم رکھنا یہ وحی بھی ضرور ہوئی ہوگی۔

تلک عشرۃ کاملۃ:۔

غرض کوہ حرا پر یہ دس وحی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بذریعہ حضرت جبرئیلؑ اتریں جن میں سے چار وحی قرآنی ہیں اور چھ غیر قرآنی۔

میں نے جو کچھ لکھا ہے درایت قرآنیہ سے لکھا ہے اور مجھ کو یہ یقین ہے کہ جو کچھ لکھا ہے **وکفی باللہ شھیدا۔ واللہ تعالی اعلم وعلمہ اتم۔**

اگر میں نے کوئی بات غلط لکھی ہے تو وہ میری خطا اجتہادی ہوگی .....؛

اللہ تعالی علیم بذات الصدور ہے اور غفار الذنوب ہے۔ **ربنا لاتواخذنا ان نسینا اواخطاءنا۔**

ماخذ:۔

حرا والی وحی کے عشرہ کاملہ افراد جو میں نے پیش کئے ہیں یہ سورہ نجم کی آیت **فاوحی الی عبدہ مااوحی** (تو اللہ نے اپنے بندے کی طرف جو وحی کرنی تھی، کی) کی ایک تفسیر ہے جو درایت قرآنیہ سے ماخوذ ہے۔ بعض کی نشاندہی تو میں نے کردی ہے۔ جیسے تلقین ایمان والی سب سے پہلی وحی جو یقیناً" صحیح ہے۔ اسی طرح اس کے بعد پہلے قرآنی وحی بسم اللہ الرحمن الرحیم یہ نبوت کی بسم اللہ تھی دوسری قرآنی وحی سورہ فاتحہ کی، سورہ فاتحہ کا نام اس کا مضمون اس کی آیتوں کی معنوی ترتیب یہ سب اس کی متقضی ہیں کہ یہ پہلی وحی قرآنی ہو بسملہ سے تو نبوت کا افتتاح ہوا نبوت کے مل جانے کے بعد پہلی وحی سورہ فاتحہ کی ہوئی اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ بسملہ سورہ فاتحہ کا جز نہیں ہے۔ بسم اللہ اپنی ایک مستقل حیثیت خود رکھتی ہے سورہ توبہ کے سوا ہر

سورۃ کے شروع میں ہے مگر کسی سورۃ کا جز نہیں ہے۔ سورہ نمل کی تیسویں۔ آیت پڑھئے درمیان سورہ میں ایک دوسری خاص حیثیت سے بسم اللہ آگئی ہے مگر ابتداء سورۃ میں کسی سورت کا جز نہیں ہے۔ سورہ فاتحہ کی بھی جز نہیں ہے۔ اسی لئے جہری قرآت والی نمازوں میں بسم اللہ کا آہستہ پڑھنا اور جہری قرآت **الحمد للہ رب العلمین** سے شروع کرنا ہی سبیل المومنین کے مطابق سنت ثابتہ ہے۔

سورہ فاتحہ کے بعد سورہ علق کی پہلی پانچ ابتدائی آیتوں کا نزول، تعلیم قرات تعلیم آداب اور تعلیم کتابت کی ضرورت کے تحت ہوا۔ اللہ تعالی کا رسولؐ ان پڑھ نہیں رہ سکتا کہ جو وحی وہ دوسروں سے لکھوائے۔ اس کی اس کو خبر نہ ہو کہ جو میں نے لکھوایا وہی لکھا گیا یا لکھنے والے نے سہوا" یا عمدا" کچھ اور لکھ دیا۔ آپؐ جن صحیفوں میں نازل شدہ آیات و سورہ لکھواتے تھے ان صحیفوں میں برابر تلاوت بھی فرماتے تھے۔ ارشاد ہے۔

رسول من اللہ یتلوا صحفا مطھرۃ۔ (سورۃ البینہ آیت ۲)

اللہ کے رسول پاکیزہ صحیفے تلاوت کرتے ہیں۔ (۹۸ : ۲)

پانچویں اور چھٹی وحی تعلیم قرات و کتابت کی تھی تو قرات کی صلاحیت پیدا کردینے کا ثبوت تو روایت سے بھی ملتا ہے جس کا تذکرہ پہلے کیا جاچکا ہے یعنی **جاء بنمط من دیباج فیہ کتاب وقال اقراء۔**

ریشم کا کپڑا حضرت جبرئیل لائے اس میں ایک نوشتہ ورق تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دے کر فرمایا پڑھیئے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے **ماانا بقاری** بار بار فرمایا، پھر معانقہ جبرئیل کے بعد پڑھ دیا۔ اسے میں ثابت کرچکا ہوں اور پھر علم بالقلم سے کتابت کی تعلیم اور قراۃ و کتابت دونوں کا ثبوت مندرجہ ذیل آیت سے پیش کرچکا ہوں۔

وما کنت تتلوا من قبلہ من کتاب ولا تخطہ بیمینک۔

(سورۃ العنکبوت آیت ۴۸)

آپ اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے نہ اپنے داہنے ہاتھ سے لکھتے

تھے۔ (۳۸:۲۹)

ساتویں وحی غیر قرآنی' طریقہ صلوۃ کی تعلیم کی اور آٹھویں وحی قرآنی حکم صلوۃ کی ان دونوں سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ آٹھویں وحی تو قرآنی ہے اس سے انکار تو کفر ہے۔ نویں وحی غیر قرآنی بابت سمت قبلہ دسویں وحی کہ کسی وحی کو صیغہ راز میں نہ رکھا جائے۔

ایک اشتباہ اور اس کا ازالہ :۔

باقی یہ کہنا کہ "سورۃ عنکبوت جو باعتبار ترتیب نزول پچیاسویں (۸۵) سورۃ ہے مکی آخری سورتوں میں سے ہے۔ اس کے بعد مکہ مکرمہ میں صرف **مطففین** ہی اتری تھی۔ بعثت سے تقریباً" دس بارہ برس بعد جو سورۃ اتری تھی۔ اس کی ایک آیت اس قدر قبل کہ عین بعثت کے وقت بعثت ہی کے مقام پر اتری ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔؟"

اگر یہ اعتراض وہ لوگ کرتے جو بیچارے "روایت پرست" کہے جاتے ہیں۔ تو ہم **سمجھتے** کہ یہ اپنی روایتوں کے آگے مجبور ہیں۔ باوجود اس کے کہ قرآنی سورۃ و آیات کا مکی یا مدنی ہونا شاذ و نادر ہی مرفوع حدیثوں سے ثابت کیا جا سکے۔ تابعین و اتباع تابعین بلکہ ان کے بھی بعد والے علماء مفسرین کے قیاسات کی بنیاد پر بہت سی مکی و مدنی سورتوں کا **تعین** کیا گیا ہے اور زمانہ نزول اور ترتیب نزول بتانے میں بھی اکثر محض قیاس سے مفسرین نے کام لیا ہے۔

مگر وہ زمانہ روایات کی گرم بازاری کا تھا۔ کئی لوگ اپنے قیاسات کے نتائج کو کسی صحابیؓ کی طرف منسوب کر کے اس کی روایات کرتے رہتے تھے۔ اس لئے ایک صحابیؓ کی طرف سے بعض مسائل میں متخالف اقوال مذکور ہیں اور بعض اقوال تو صراحتہ" خلاف عقل ہوتے تھے مگر روایات کی گرم بازاری تھی۔ اس لئے لوگ اپنی کتابوں میں لکھ دیتے تھے۔

مثلاً" اتقان فی علوم القرآن جلد اول صفحہ ۱۷ مطبوعہ مطبع حجازی قاہرہ

میں ملاحظہ فرمایئے۔

اول ایتہ نزلت فی الاطعمتہ بمکتہ ایتہ الانعام' قل واجلا نیما اوحی ان محرم الایتہ ثمہ ایتہ النمل فکلوا مما رزقکم اللہ حلا لا طیبا الی اخرھا۔

وبا لمد ینتہ ایتہ البقرۃ انما حرم علیکم المیتتہ الایتہ ثمہ ایتہ المائدۃ حرمت علیکم المیتتہ قالہ ابن حصار۔

"کھانے کی چیزوں کے متعلق سب سے پہلی آیت جو مکہ مکرمہ میں اتری سورہ انعام والی آیت **قل لا اجد فیما اوحی الی محرما الخ** ہے۔ اس کے بعد (مکہ ہی میں) سورہ نحل کی آیت **وکلو مما رزقکم اللہ حلا لا طیبا الخ** اس کے بعد مدینہ میں سورہ بقر کی آیت اتری **انما حرم علیکم المیتتہ الایتہ** اس کے بعد سورہ مائدہ کی آیت (مدینہ میں) اتری **حرمت علیکم المیتتہ الخ** یہ ابن حصار کا قول ہے۔"

ابن حصار نے صرف سورتوں کی ترتیب نزول کو پیش نظر رکھا۔ اور آیتوں کی ترتیب نزول کو معنی و مفہوم کے ذریعے سمجھنے کی مطلق کوشش نہیں کی۔

آیتوں کی ترتیب نزول کو بالکل الٹ دیا۔ اول کو آخر اور آخر کو اول بنا دیا۔

پھر اسی کتاب کے صفحہ ۱۹ میں ہے۔

وفی البرھان لامام الحرمین ان قولہ تعالی قل لا اجد فیما اوحی الی محرما الایتہ من اخر مانزل و تعقبہ ابن الحصار بان السورۃ مکیتہ بالاتفاق ولم یرد نقل بتاخیر ھذہ الایتہ عن نزول السورۃ بل ھی فی محاجتہ المشرکین و مخاصمتھم وھم بمکتہ۔

امام الحرمین اپنی کتاب برہان میں لکھتے ہیں کہ **قل لا اجد فیما اوحی الی الایتہ** (جو سورہ انعام مکی کی آیت ہے) یہ آخری آیت ہے کھانے کی چیزوں کے بارے میں تو ابن حصار نے ان پر اعتراض کیا ہے کہ سورہ انعام بالاتفاق مکی سورہ ہے۔ اور کوئی روایت ایسی منقول نہیں جس سے معلوم ہو کہ یہ آیت اپنی سورۃ سے بہت بعد نازل ہوئی بلکہ یہ آیت مشرکین مکہ سے حجت و بحث اور مناظرہ کے سلسلے میں اتری تھی اور وہ جھگڑنے والے مکہ ہی

میں تھے۔

اب میں ابن حصار کے خلاف عقل قول پر ماتم کروں یا اس قول کو علامہ جلال الدین سیوطی کے بلا تکلف اور بغیر تنقید کے نقل کردینے پر کہ انہوں نے خود آیتوں کے مفہوم پر مطلق غور کیوں نہ کیا۔

اب سورۃ انعام کی پوری آیت کو آپ خود سامنے رکھ کر اس کے الفاظ اور مفہوم پر غور کیجئے کہ یہ واقعی سب سے پہلی آیت ہوسکتی ہے یا سب سے آخری؟

قل لا اجد فیما اوحی الی محرما علی طاعم یطعمہ الا ان یکون میتۃ او دما مسفوحا اولحم خنزیر فانہ رجس اوفسقا اھل لغیر اللہ بہ۔

"(ترجمہ از ابوالکلام آزاد مرحوم) اے پیغمبر تم کہہ دو جو وحی مجھ پر بھیجی گئی ہے۔ میں اس میں کوئی چیز حرام نہیں پاتا کہ کھانے والے پر اس کا کھانا حرام ہو الا یہ کہ مردار ہو یا بہتا ہوا خون ہو یا سور کا گوشت ہو کہ یہ چیزیں بلاشبہ گندگی ہیں یا پھر جو چیز موجب معصیت ہو کہ غیر اللہ کا نام اس پر پکارا گیا ہو تو بلاشبہ وہ بھی حرام ہے۔"

(عربی جاننے والے ہر ہر لفظ کے ترجمے پر نگاہ ڈالیں)

مولانا مودودی صاحب سلمہ اللہ تعالی یہ ترجمہ لکھتے ہیں:۔

"(اے محمدؐ) ان سے کہو کہ جو وحی میرے پاس آئی ہے اس میں تو میں کوئی ایسی چیز نہیں پاتا جو کسی کھانے والے پر حرام ہو الا یہ کہ وہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون ہو یا سور کا گوشت ہو کہ وہ ناپاک ہے یا فسق ہو کہ اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔"

متاخرین چونکہ اگلے مترجمین کے ترجمے سامنے رکھ کر خود ضرور اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اگلوں سے زیادہ صحیح اور فصیح و واضح ترجمہ کیا جائے اس لئے میں نے دو متاخر علمائے وقت کے ترجمے نقل کردیئے ایک تو مرحوم ہوگئے غفراللہ لی ولہ (یعنی ابوالکلام آزاد مرحوم)

"دوسرے[1] بفضلہ تعالی زندہ ہیں۔ سلمہ اللہ تعالی۔

ان دونوں ترجموں کے متعلق بھی مجھے کچھ لکھنا ہے مگر وہ بعد کو لکھوں گا

[1] اب وہ مرحوم ہوچکے ہیں۔ انا للہ

ابھی اتقان سے نبٹ لیجئے۔ ابن حصار **قل لا اجد فیما اوحی الی محرما الایۃ** کو کھانے کی چیزوں کے متعلق مکہ میں اترنے والی سب سے پہلی آیت قرار دے رہے ہیں۔

علامہ ابوالکلام مرحوم کے ترجمے میں آپ نے پڑھا "تم کہہ دو جو وحی مجھ پر بھیجی گئی ہے۔ میں اس میں کوئی چیز حرام نہیں پاتا الا ......" مولانا مودودی سلمہ اللہ تعالی لکھتے ہیں۔ "ان سے کہہ دو کہ جو وحی میرے پاس آئی ہے اس میں تو میں کوئی چیز ایسی نہیں پاتا جو کسی کھانے والے پر حرام ہو الا یہ کہ ...." یہ دونوں ترجمے اور جس کا بھی آپ ترجمہ دیکھیں گے ہر ترجمہ ضرور بہانگ دہل اس کا اعلان کرے گا اور یہ دونوں ترجمے بھی اعلان کررہے ہیں کہ اس آیت کے نزول سے پہلے کھانے کی چیزوں میں کون کون سی چیزیں مسلمانوں پر حرام کی گئی ہیں۔ اس کے بیان کی آیتیں ضرور اتر چکی ہیں۔ اس لئے امام الحرمین نے جو اپنی کتاب میں اس آیت کو جن چیزوں کا کھانا حرام ہے ان چیزوں کے بیان کی آخری آیت لکھا ہے۔ بہت صحیح لکھا ہے۔

ابن حصار نے اصل میں یہ دیکھا اور ان کے ساتھ جلال الدین سیوطی نے بھی کہ یہ آیت سورۃ الانعام مکی سورۃ کی ہے اور دوسری آیتیں مدنی سورۃ کی ہیں اس لئے انہوں نے غور و فکر سے کام لئے بغیر یہ فیصلہ کرڈالا کہ مکی سورۃ کی آیت کو مدنی سورتوں کی آیتوں سے پہلے اترنے والی ہی سمجھنا ہوگا۔ چاہے آیت خود چیخ چیخ کر کہے کہ سورۃ مکی ہوا کرے میں مدنی ہوں۔

علامہ سیوطی تو اپنی اسی اتقان کی اسی جلد میں بہت سی مدنی آیتیں مکی سورتوں میں اور مکی آیتیں مدنی سورتوں میں داخل ہونے کا ذکر اور ان آیتوں کی نشاندہی کرچکے ہیں۔ اس لئے اگر سورۃ انعام کی یہ آیت دیر کرکے مدینے میں اتری ہو تو اس میں کونسی قباحت ہے۔ خصوصاً جب الاتقان جلد اول صفحہ ۱۵ میں خود سورۃ انعام کی بعض آیتوں کے متعلق لکھا ہے کہ فلاں فلاں آیتیں مدینے میں اتری تھیں۔ باقی رہا کسی روایت کا نہ ہونا تو (مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید) آیت تو خود پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ میرا

نزول اس مضمون کی دوسری سب آیات کے بعد ہوا ہے۔

آیت کے مذکورہ ترجموں میں غلطی

آیت مذکورہ کے ترجمے میں ایک غلطی ہوئی ہے۔ اگر دوسری آیتوں کو سامنے رکھ کر غور کیا جاتا تو ترجمہ غلط نہ کیا جاتا۔ لفظی اعتبار سے بھی دونوں ترجمے غلط ہیں۔ مولانا مودودی نے علامہ ابو الکلام آزاد کے بعد ترجمہ لکھا ہے۔ اس لئے سنبھلنے کی کوشش کی ہے مگر سنبھل نہ سکے۔

سب آیتوں کو یکجا کر کے غور کرنے سے صاف پتہ چل جاتا ہے۔ بات یہ تھی کہ مومنین سے فرمایا گیا تھا کہ **احلت لکم بھیمۃ الانعام الا مایتلی علیکم الایۃ۔** تمہارے لئے چرند' چارپائے حلال کئے گئے۔ بجز اس کے جو تمہیں بتائے جاتے ہیں۔ یعنی مردار' خون' سور کا گوشت (معہ تمام اجزا کے) اور جو جانور غیر اللہ کے نام پر ذبح ہوا ہو۔ اور یہ بھی فرمایا گیا کہ "**طعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم**" کہ اہل کتاب کا طعام تمہارے لئے حلال ہے بجز ان چار چیزوں کے اور اہل کتاب (یہودی و نصاری) ان دونوں کے درمیان خود حلال و حرام میں اختلاف ہے تو جو چیزیں ایک کے یہاں حرام ہیں اور دوسرے کے یہاں حلال' ان چیزوں کے متعلق مومنین کیا کریں گے؟ اس سوال کا جواب بتا دیا گیا ہے کہ:۔

قل لا اجد[1] فیما اوحی الی محرما علی طاعم یطعمہ الا ان یکون میتۃ الایۃ۔ یطعمہ صفت ہے طاعم کی۔ ترجمہ بالکل صاف ہے کہ میری طرف جو

---

[1] لا اجد متعدی بدو مفعول۔ شیئا مفعول اول محذوف ہے محرما" مفعول دوم ہے۔ علی طاعم کا تعلق محرما" سے ہے اور یطعمہ طاعم کی صفت ہے۔ جس کی ضمیر مفعولی اسی شیئا مفعول اول محذوف کی طرف پھرتی ہے۔ یہ آیت جواب ہے۔ ایک اعتراض کا۔ مومنین کو حرام و حلال بتانے کے لئے نہیں اتری ہے۔ سب سے پہلی آیت سورہ مائدہ والی جو حرمت علیکم المیتۃ سے شروع ہوئی ہے مخالفین نے اعتراض کیا کہ یہ لوگ جس کو خود مار ڈالتے ہیں اس کو حلال سمجھتے ہیں اور جس کو اللہ تعالی نے مارا ہے یعنی مردار اس کو حرام سمجھتے ہیں۔ تو سورۃ البقرہ والی آیت حصر کے ساتھ آئی انما حرم علیکم فرمایا گیا۔ جس میں صفت کا واضح قصر ہے۔ موصوف پر یعنی حرمت کا

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳ پر

وحی کی گئی ہے میں اس میں کوئی ایسی چیز نہیں پاتا جو کسی کھانے والے پر حرام ہو اور وہ اس کو کھا رہا ہو بجز ان چار چیزوں کے یعنی یہودیوں یا نصاری ان کے لئے بھی **بھیمۃ الانعام** ہی حلال ہیں اور یہ چار چیزیں ان پر بھی حرام تھیں۔ مگر ان میں سے ایک فریق ان حرام چیزوں کو کھا رہا ہے تو جب وہ ان چار چیزوں میں سے کوئی چیز کھائے گا تو ہم اس کے ساتھ نہیں کھائیں گے۔ ان چار چیزوں کے علاوہ جو چیز وہ کھائیں گے ہم کھا سکتے ہیں۔

اس کے بعد یہود و نصاری کے درمیان حلال و حرام کا جو فرق ہے وہ یہود کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے باقی ہے۔ بعض چیزیں یہود کی شورہ پشتی کی وجہ سے تعزیرا" ان پر حرام کردی گئی تھیں۔ **ذالک جزینا ھم ببغیھم** (یہ ہم نے ان کو ان کی سرکشی کی سزا دی تھی) حضرت عیسی ؑ علی نبینا و علیہ السلام کی بعثت کی ایک غرض یہ بھی تھی کہ یہودیوں سے وہ تعزیری احکام اٹھا لئے جائیں۔ حضرت عیسی ؑ نے یہودیوں سے اپنی بعثت کے مقاصد بیان کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا کہ:۔

ولا حل لکم بعض الذی حرم علیکم (سورۃ آل عمران آیت ۵۰)

"اور میں اس لئے آیا ہوں کہ بعض چیزیں جو تم پر تعزیرا" حرام کردی گئی تھیں اب ان کو تمہارے لئے حلال کردوں۔" (۳:۵۰)

یہ بیان کر کے ان کا جواب دے دیا کہ اللہ تعالی نے جو تعزیری احکام یہود پر عائد فرمائے تھے ان کو تو اٹھانے اور منسوخ کرنے کے لئے حضرت عیسی ؑ کو بھیج ہی دیا تھا۔ مگر یہود حضرت عیسی ؑ پر ایمان نہ لائے اور اپنے پر وہ تعزیری احکام باقی رکھے رہے تو ہم ان کی اس حماقت میں ان کا ساتھ

بقیہ حاشیہ

قصر ہے۔ اشیائے اربعہ پر سب آیتوں کو ملا کر غور نہیں کیا گیا چونکہ ان اشیائے اربعہ کی حرمت میں مشرکین نے تذبذب پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس لئے یہاں حصر کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت ہوئی ورنہ پہلے کہا جا چکا تھا۔ حرمت علیکم المیتۃ پھر دوبارہ حصر کے ساتھ کہنے کی کیا ضرورت پڑی؟ لوگوں کے تذبذب کو مٹانے کے لئے۔ اس کے بعد یہود و نصاری میں جو حلت و حرمت کا اختلاف بطور اعتراض پیش کیا گیا تو اس کا جواب بتایا گیا۔ قل لا اجد فیما اوحی الی محرما یعنی شیئا محرما علی طاعم یطعمہ سب متعلقہ آیات کو یکجا کر کے غور کیجئے بات واضح ہو جائے گی ۔ انشاء اللہ تعالی۔

کیوں دیں گے۔ بحث تو یہاں تشریعی یعنی حلال و حرام میں ہے۔ جو حقیقی حلال و حرام ہے۔ تعزیری حکم تو مجرمین ہی پر رہے گا۔ جو مجرم نہ ہو وہ کیوں ان کی تعزیر میں شرکت کرے گا۔

غرض متعلقہ آیات کو ملا کر دیکھنے سے مضمون بھی واضح ہو جاتا ہے اور آیت کا ترجمہ بھی درست ہو جاتا ہے۔

عود الی المقصود:۔

بات سے بات پیدا ہوتی ہے۔ یہ ایک نئی بحث بیچ میں آگئی۔ اس بحث کا اصل مقصد یہ ہے کہ بہت سی مکی سورتوں میں مدنی آیتیں اور مدنی سورتوں میں مکی آیتیں نظر آتی ہیں۔ اور پھر سورتوں کی ترتیب نزول تو بہت بعد والوں نے محض قیاسات سے قائم کی ہے۔ جس کو خود علماء نے اپنی تفسیروں میں لکھ دیا ہے۔

اتقان میں مکی و مدنی کے فرق اور ترتیب و تقدیم اور تاخیر نزول کے ذکر میں علامہ سیوطی لکھتے ہیں۔

قال القاضی ابوبکر فی الانتصار الاقوال لیس فیھا شیئی مرفوع الی النبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم وکل قالہ بضرب من الاجتہاد و غلبتہ الظن۔

"یعنی قاضی ابوبکر نے اپنی کتاب الانتصار میں لکھا ہے کہ یہ جتنے اقوال ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہو۔ ہر ایک نے جو کہا ہے اپنے اجتہاد اور گمان غالب سے کہا ہے۔"

اس کے بعد احتمالات لکھتے ہیں کہ ممکن ہے کہ راوی نے اس سے سنا ہو جس نے ٹھیک وفات نبوی ہی کے دن حضور علیہ السلام سے سنا ہو یا کچھ پہلے وغیرہ ذالک من الادہام ------------ آیت **(اتل مااوحی الایتہ)** سورہ عنکبوت کی آیت ۴۵ ہی ہے۔ اس لئے ہم یہاں بحث سورہ عنکبوت سے بھی کرتے ہیں تو دیکھئے مولانا مودودی سلمہ اللہ یہاں اپنی تفسیر تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۶۷۲ میں سورہ عنکبوت کا تعارف کراتے ہوئے اس سورۃ کے زمانہ نزول کے متعلق تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں۔

زمانہ نزول:۔

"آیات ۵۶ تا ۶۰ سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ یہ سورہ ہجرت حبشہ سے کچھ

پہلے نازل ہوئی تھی۔ باقی مضامین کی اندرونی شہادت بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔ کیونکہ پس منظر میں اسی زمانے کے حالات جھلکتے نظر آتے ہیں بعض مفسرین نے صرف اس دلیل کی بناء پر کہ اس میں منافقین کا ذکر آیا ہے اور نفاق کا ظہور مدینے میں ہوا ہے یہ قیاس قائم کرلیا کہ اس سورت کی ابتدائی دس آیات مدنی ہیں۔ اور باقی سورت مکی ہے حالانکہ یہاں جن لوگوں کے نفاق کا ذکر ہے یہ وہ لوگ ہیں جو کفار کے ظلم و ستم اور شدید جسمانی اذیتوں کے ڈر سے منافقانہ روش اختیار کررہے تھے اور ظاہر ہے کہ اس نوعیت کا نفاق مکہ ہی میں ہو سکتا تھا۔ نہ کہ مدینے میں۔ اسی طرح بعض دوسرے مفسرین نے یہ دیکھ کر کہ اس سورت میں مسلمانوں کو ہجرت کرنے کی تلقین کی گئی ہے اسے مکہ کی آخری نازل شدہ سورت قرار دیا ہے۔ حالانکہ مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے سے پہلے مسلمان حبشہ کی طرف بھی ہجرت کرچکے تھے۔ یہ تمام قیاسات دراصل کسی روایت پر مبنی نہیں ہیں بلکہ صرف مضامین کی اندرونی شہادت پر ان کی بناء رکھی گئی ہے۔ اور یہ اندرونی شہادت اگر پوری سورۃ کے مضامین پر بحیثیت مجموعی نگاہ ڈالی جائے تو مکہ کے آخری دور کی نہیں بلکہ اس دور کے حالات کی نشاندہی کرتی ہے جس میں ہجرت حبشہ واقع ہوئی تھی۔"

مولانا مودودی نے جو کچھ لکھا ہے بہت صحیح لکھا ہے۔ **فللہ درہ ثم للہ درہ**

ہجرت حبشہ ماہ رجب سنہ ۵ نبوی میں ہوئی تھی اور سورہ عنکبوت ہجرت حبشہ سے بہت پہلے اتری تھی۔ بلکہ مجھ کو تو تقریباً یقین ہے کہ نبوت کے پہلے ہی سال یہ سورت اگر پوری نہیں تو اس کی کچھ آیتیں ضرور اتر گئی تھیں۔ خصوصاً" آٹھویں آیت **ووصینا الانسان بوالدیہ حسنا الایتہ** کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ' بعثت کے کچھ ہی دنوں کے بعد ایمان لائے تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے ایمان لانے کے دوسرے ہی دن انہی کی ترغیب و تبلیغ سے۔ خود حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کا بیان ہے کہ یہ آیت میرے ہی متعلق اتری تھی۔ جس کی روایات صحیح مسلم۔ جامع ترمذی۔ سنن ابی داؤد و نسائی' ابن ماجہ اور مسند امام احمد میں موجود ہے اور ترمذی نے اس کو "حدیث حسن صحیح" لکھا ہے۔ اسی طرح اس سے پہلے کی آیتیں چند السابقون الاولون کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

علامہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم اپنی تفسیر فتح البیان فی مقاصد القرآن ج ۷ صفحہ ۱۴۱ میں لکھتے ہیں:۔

"حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنے اسلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جن لوگوں نے عام طور پر ظاہر کیا وہ ابوبکرؓ تھے اور عمارؓ بن یاسرؓ اور ان کی ماں حضرت سمیہؓ اور صہیبؓ اور بلالؓ اور مقدادؓ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت ظاہری ابوطالب کرتے تھے ابوبکر صدیقؓ کا قبیلہ ان کا حامی تھا۔ باقی حضرت عمارؓ اور ان کی والدہ ماجدہ اور حضرت صہیبؓ حضرت بلالؓ اور حضرت مقدادؓ ان بے چاروں کا کوئی حامی نہ تھا۔ یہ لوگ طرح طرح سے ستائے جانے لگے۔ ان میں حضرت بلالؓ تو ہر طرح ثابت قدم رہے حضرت سمیہؓ شہید ہی ہو گئیں۔ بعضے بیچارے اذیت پر اذیت سے تنگ آکر کبھی جو کچھ لوگ ان سے کہلوانا چاہتے مجبوراً" کہہ دیتے تھے تو کچھ دیر کے لئے نجات مل جاتی تھی۔ اسی سلسلے میں **ولقد فتنا الذین من قبلھم الایۃ** اتری تھی۔ کہ اگلی امتوں کے ایمان کی بھی اسی طرح آزمائش ہوئی تھی۔" الخ

مختصر یہ کہ سورہ عنکبوت بہت ابتدائی مکی سورتوں میں سے ہے بعض آیتیں بہت قبل کی ہوں۔ بعض ہجرت حبشہ سے کچھ پہلے کی بعضے کچھ بعد کی ممکن ہے تو اسی سورہ کی آیت زیر بحث **(اتل ما اوحی الیک)** کا کوہ حرا پر اترنا کیوں ناممکن سمجھا جائے گا۔

جو لوگ عام طور سے روایات کو دین میں حجت سمجھتے ہیں وہ بھی آیات و سور کے مکی و مدنی ہونے کے فرق کو اور ترتیب نزول کے محض قیاسی و ظنی نمبروں کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ مگر حیرت ہے ان لوگوں پر جو صحیح سے صحیح حدیث کو بھی دین میں حجت نہیں سمجھتے۔ چودہ سو برس کے پوری امت کے بلا اختلاف تعامل متواتر کی مطلق پرواہ نہیں کرتے، مگر اپنی بات رکھنے کے لئے کوئی سہارا انہیں مل سکا تو "شیخ محمد دین اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار لاہور" کے ہاں کا مطبوعہ قرآن کے شروع میں جو ترتیب نزول کے مطابق سورتوں پر نمبر لگائے ہیں اسی کا سہارا لے کر حقائق ثابتہ جو قرآنی آیت سے ثابت کئے گئے ہیں ان کو جھٹلانے کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ڈوبنے سے بچا نہیں سکتا۔ ان کی یہ ہٹ دھرمی دنیا میں نہیں

تو آخرت میں ضرور لے ڈوبے گی۔

دیانت دار ناظرین ترتیب نزول کے نمبروں سے دھوکا نہ کھائیں۔ اس لئے دکھا دیا کہ سورہ عنکبوت جو بالکل ابتدائی سورت ہے یقیناً "بعثت نبوی ہی کے سال اگر پوری سورت نہیں تو اس کی متعدد آیتیں ضرور اتر گئیں تھیں اور باقی بھی سنہ ۵ نبوی سے پہلے اتر چکی تھیں۔ اس کو نمبر لگانے والوں نے قلت تدبر کی وجہ سے مکی سورتوں میں سے بالکل آخری سورت قرار دیتے ہوئے یہ بھی کہا کہ اس کے بعد صرف ایک ہی سورۃ **مطففین** اتری تھی۔ پھر علوم القرآن والے تو خود لکھ رہے ہیں کہ مکی سورتوں میں مدنی اور مدنی سورتوں میں مکی آیات ہیں۔ پہلے اتری ہوئی بعض آیتیں بعد کی سورتوں میں اور بعد کی اتری ہوئی بعض آیات پہلی سورت میں بھی ہیں۔ تو پھر یہ کہنا کہ "یہ آیت فلاں سورت میں ہے اور وہ بہت بعد کو اتری ہے اس لئے اس آیت سے استدلال غلط ہے۔" بددیانتی ہے یا تاریخ القرآن سے ناواقف جہلا ہی ایسا کرسکتے ہیں۔ دیکھنا چاہئے اصل استدلال کو مدعی جس آیت سے جو استدلال کررہا ہے اس آیت کے سیاق و سباق' استدلال پیش کرنے والے کے دعوی کو ثابت کررہے ہیں یا نہیں؟ اور مدعی اس آیت کے علاوہ بھی کوئی دلیل اپنے دعوی کے ثبوت میں پیش کررہا ہے یا نہیں اگر آیت خود مدعی کے دعوی کو ثابت کررہی ہے تو پھر کسی دوسری دلیل کی ضرورت ہی نہیں اور اگر کچھ قرائن بھی مدعی کے دعوی کی تائید کرتے ہیں تو اس کے بعد بھی صرف ترتیب نزول کے ظنی و وہمی نمبروں پر کان لگا کر مفہوم آیت و قرائن ثابتہ سب کا انکار کردینا تو کھلی ہوئی بددیانتی ہے۔

اصل مختلف فیہ مسئلہ:۔

اصل مابہ الاختلاف تو یہ ہے کہ حضرت جبریل جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوہ حرا پر آئے اور اللہ تعالی نے **"فاوحی الی عبدہ مااوحی"** کے مطابق بذریعہ جبریل جو وحی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی وہ صرف ایک وحی تھی یا متعدد۔؟

سیاق و سباق اس جملہ کا صاف بتلا رہا ہے اور قرینہ واضحہ قرآنیہ بھی

دلالت کر رہا ہے کہ متعدد وحی ہوئیں۔ قرآن مبین خود بیان فرما رہا ہے۔ کہ آپ' ایمان کی حقیقت سے ناواقف تھے۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے (سورۃ شوریٰ کی آیت ۵۲ پیش کر کے) تو کیا یہ ممکن تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حقیقت ایمان سے آگاہ کئے بغیر آپ' کو نبوت کا منصب دے دیا جاتا؟

سب سے پہلے تلقین ایمان کی وحی کا اترنا ضروری تھا اور اس وحی کا غیر قرآنی ہونا بھی ضروری تھا۔ کما مر تو وہ اصل مختلف فیہ مسئلہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف قرآنی ہی وحی آئی یا غیر قرآنی وحی بھی آئی؟ اگر صرف قرآنی ہی وحی آئی تھی تو وہ کونسی آیت سب سے پہلے کوہ حرا پر اتری تھی جس میں پہلے آپ' کو ایمان کی حقیقت سے آگاہ فرمایا گیا تھا اور اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو منصب نبوت و رسالت عطا ہوا تھا۔ کوئی ایسی آیت تلقین ایمان کی جس کے مخاطب خاص طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں پیش نہیں کی جا سکتی تو ماننا پڑے گا کہ تلقین ایمان ہی کی وحی پہلے پہل حضور' کے سامنے اللہ تعالیٰ کی وحی کی حیثیت سے حضرت جبریل نے اپنے الفاظ میں پیش کی تھی اور اس وحی کا غیر قرآنی ہونا ہی ضروری تھا۔ کیونکہ کتابی وحی غیر نبی پر نہیں آسکتی۔ اور جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم مومن نہ ہولیتے آپ' نبی نہیں ہوسکتے تھے۔ اس لئے پہلے تلقین ایمان کی غیر قرآنی وحی ہی آپ کے پاس بھیجنی ضروری تھی۔ جب تلقین ایمان ہوچکی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اول المومنین ہوچکے تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو منصب نبوت عطا ہوا اور پہلی قرآنی وحی بسم اللہ الرحمن الرحیم کی حضرت جبریل نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کی اور دوسری قرآنی وحی سورۃ فاتحہ کی پیش کی جو ام الکتاب اور پورے قرآن مجید کا مقدمہ اور دیباچہ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم منصب نبوت سے ان دونوں قرآنی وحیوں کے ذریعے مشرف ہوگئے صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔

پھر ایاک نعبد کے اقرار کے بعد ضروری تھا کہ عبادت کے طریقے کی بھی تعلیم اسی وقت ہوجائے کیونکہ جس بات کا صحیح مفہوم اقرار کرنے والے کو معلوم نہ ہو وہ اس بات کا اقرار کس طرح کرے گا؟ اور جس طرح حضرت

موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام کو منصب نبوت و رسالت کے ساتھ ساتھ اقم الصلوٰۃ لذکری کا حکم ہوا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اسی وقت ہوا۔ اور جب نماز کا حکم ہوا تو ناممکن ہے کہ نماز کا حکم ہو اور اس کا طریقہ نہ بتا دیا جائے۔ میں تو یہی سمجھا ہوں کہ یہی سورۃ عنکبوت والی آیت جس سے قرآن مجید کا اکیسواں پارہ شروع ہوتا ہے۔ یہی آیت حکم نماز کی پہلے پہل اتری جس میں کسی وقت کی تعین نہیں کی گئی ہے۔ اور جس کے صرف حضور

لہ یہ سمجھنا درست نہیں کہ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ تعالیٰ پر فطری ایمان تھا اس لئے آپ کو تلقین ایمان کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اللہ پر فطری ایمان ہوگا مگر فرشتوں پر کتب الہیہ پر' اگلے رسولوں پر اور قیامت پر ایمان کی تفصیل کا علم نہ ہوگا اور اسی لئے قرآن مجید میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب فرماتے ہوئے ارشاد الٰہی ہے کہ فما کنت تدری ما الکتاب ولا الایمان (سورۃ شوریٰ آیت ۵۲) (تم تو جانتے بھی نہ تھے کہ کتاب اللہ کیسی ہوتی ہے بلکہ ایمان کی حقیقت سے بھی ناواقف تھے (۴۲ : ۵۲) اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت بخشنے سے پہلے ایمان کی تلقین ضرور فرمائی گئی ہوگی۔ جیسا کہ سورہ طہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کو پہلے ایمان کی تلقین کی گئی پھر اسی وقت حضرت موسیٰ کو اقم الصلوۃ کا حکم ہوا اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے بذریعہ جبریل تلقین ایمان کی وحی غیر متلو ملی پھر سورہ فاتحہ کی وحی قرآنی کے وقت ایاک نعبد کے اقرار کے عملی ثبوت کی تعلیم دینے کے لئے نماز کے طریقہ کی تعلیم فرمائی گئی۔ اور جس طرح حضرت موسیٰ سے فرمایا گیا تھا اسی طرح انہی لفظوں میں اقم الصلوۃ کا حرا ہی میں حکم ہوا۔ اور یہ حکم بغیر تعیین وقت کے تھا یعنی چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار نماز فرض ہوگئی۔ جس وقت موقع ہو پڑھ لی جائے پھر تعیین وقت کا جب دور آیا تو یہی اقم الصلوۃ کا فقرہ اوقات کے ذکر کے ساتھ فرمایا گیا۔ "اقم الصلوۃ طرفی النہار و زلفا" من الیل" (نماز قائم کرو دن کے دونوں کناروں کے وقت اور رات کی گھڑیوں میں) اور اقم الصلوۃ لدلوک الشمس الی غسق الیل وقران الفجر (نماز قائم کرو آفتاب کے ہر دوک کے وقت' رات کی تاریکی تک الخ) غرض "اقم الصلوۃ کے مطلق جملہ سے جب کسی نبی کو حکم فرمایا گیا تو اس سے مراد غیر معینہ مدت شبانہ یوم میں صرف ایک بار نماز کا حکم ہے' اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے پہل جب یہ حکم ہوا تو بغیر تعیین وقت کے ہوا ہے اور عین بعثت کے وقت ہوا ہے۔ اس کے بعد جب بھی اس فقرہ (اقم الصلوۃ) سے حکم ہوا ہے تو اوقات کی تعیین کے ساتھ ہوا ہے۔ یہ نکتہ یاد رہے۔

صلی اللہ علیہ وسلم ہی مخاطب تھے۔ کوئی دوسری آیت اس وقت کے مناسب حال اس کے سوا پیش نہیں کی جاسکتی اس لئے اسی آیت کو پہلی آیت حکم نماز کی ماننا پڑے گا۔ پھر نماز پڑھنے کا طریقہ بتلانے والی کوئی آیت ایسی نہیں پیش کی جاسکتی جس میں جملہ ارکان نماز مع ہیئت ارکان و اذکار ارکان بتائے گئے ہوں جب آپ کوئی ایسی آیت پیش نہیں کرسکتے اور اس وقت تو ابھی صرف بسم اللہ اور سورہ فاتحہ ہی اتری تھی سورہ علق کی پانچ ابتدائی آیتوں کی مشہور روایت کو بھی لے لیجئے تو ان تیرہ آیتوں کی تعریف کیا ہوگی اور ان کی تعریف سے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے ارکان قیام و رکوع و سجود اور ان کے اذکار کس طرح تصنیف فرماسکتے تھے۔ ان آیتوں میں تو قیام رکوع و سجود کا ذکر تک نہیں ہے۔ بلکہ صلوٰۃ کا بھی لفظ کہیں نہیں آیا ہے۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ وحی غیر قرآنی کے ذریعے بذریعہ حضرت جبریل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کے ارکان وہیئات ارکان و اذکار ارکان کی اللہ تعالیٰ نے تعلیم فرمائی۔

پھر نماز میں سمت قبلہ بسوئے بیت المقدس کی وحی بھی غیر قرآنی تھی۔ اسی وقت بذریعہ جبریل ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی۔ سیقول السفھاء من الناس ماولھم عن قبلتھم التی کانوا علیھا الایتہ (سورۃ البقرہ آیت ۱۴۲)
عنقریب بیوقوف لوگ کہیں گے کہ جس قبلے کی طرف یہ لوگ نماز پڑھتے چلے آرہے تھے اس سے کس بات نے ان کا رخ پھیردیا (۲: ۱۴۲) یہ آیت تو صاف بتا رہی ہے کہ تیرہ برس تک مکہ مکرمہ میں اور سترہ مہینے تک مدینہ منورہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے رہے تھے تو کس کے حکم سے ان دنوں تک بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنائے رکھا تھا۔ کون سی آیت اتری تھی۔؟ جس کی بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف رخ کرکے اتنی مدت نماز پڑھتے رہے۔ آپ کوئی آیت پیش نہیں کرسکتے۔ تو ماننا پڑے گا کہ سمت بیت المقدس کو قبلہ بنانے کی وحی بھی اسی کوہ حرا پر غیر قرآنی ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ جبریل ملی تھی۔ طریقہ نماز کی تعلیم کے ساتھ سمت قبلہ بھی بیک وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی کوہ حرا پر بتائی گئی تھی۔ وحی غیر قرآنی سے بالکل انکار کی مطلق گنجائش نہیں۔ اگر آپ کچھ کہہ سکتے ہیں تو بس اسی قدر کہ زمانہ بعثت کے قبل و بعد مطلقاً" وحی غیر قرآنی بھیجی گئی۔

کوہ حرا سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی اور اقامتہ الصلوۃ کا ایمان افروز مبارک دور

اے کہ بر آستان تو سجدہ کائنات تو   ہست نوید زندگی حی علی الصلوٰۃ تو

نماز کا پہلا دور مبارک

کوہ حرا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر واپس آئے اور حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ اپنی زوجہ مطہرہ سے پورا حال کوہ حرا کا بیان فرمایا۔ حضور علیہ السلام عام طور پر صادق اور امین مشہور تھے۔ گھر کے سب لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکارم اخلاق سے دوسروں سے زیادہ واقف تھے۔ وہ فوراً" ایمان لے آئیں۔ آپؐ کی دو صاحبزادیاں بالغ شادی شدہ تھیں۔ بڑی حضرت زینب رضی اللہ عنہا حضرت ابوالعاصؓ بن الربیع کی زوجہ تھیں۔ منجھلی حضرت رقیہؓ حضرت عثمانؓ بن عفان کی حرم محترم تھیں۔ یہ دونوں بھی ایمان لے آئیں۔

حضرت زیدؓ بن حارثہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنی تھے۔ اس لئے اس وقت زید بن محمدؐ ہی عام طور سے کہے جاتے تھے۔ وہ عاقل بالغ تھے وہ بھی ایمان لے آئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ' کی عمر تحقیقی طور پر اس وقت پانچ برس کی تھی ہاں شیعہ رواۃ نے بالاختلاف آٹھ دس اور بارہ برس کی عمر روایت کرکے آپ کو بالغ تو ثابت نہ کرسکے مگر سن شعور والا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے بہرحال سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں حضرت علیؓ کا نام گرامی بھی ہے حضرت ابوبکرؓ جو بچپن اور جوانی ہی سے برابر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخلص اور جانثار دوست تھے وہ بھی ایمان لے آئے۔ یوں عورتوں میں سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ بالغ آزاد مردوں میں سب سے پہلے حضرت صدیق اکبرؓ غلاموں میں سب سے پہلے حضرت زیدؓ بن حارثہ بچوں میں

سے حضرت علیؓ ایمان لائے۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

گھر آنے کے بعد دن کو بھی اور رات کو بھی جس وقت جذبہ بندگی کا ولولہ اٹھتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے تھے۔ دوسروں کے بارے میں نماز کی تعلیم و ترغیب کا ابھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم نہیں ہوا تھا۔ اس لئے ابھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی دوسرے کو نماز کا حکم نہیں دیا۔ اور گھر کے لوگوں نے بھی یہی خیال کیا کہ شاید یہ حکم نبیؐ کی ذات کے لئے مخصوص ہو۔ اس لئے گھر ہی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم چند دنوں تک تنہا نماز پڑھتے رہے۔ گھر پر دو ایک دن پڑھنے کے بعد خانہ کعبہ کے پاس بھی بیت المقدس ہی کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے کو جانے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کو صیغہ راز میں نہیں رکھا تھا اور گھر کے لوگوں سے بھی کہہ دیا تھا کہ اس کو صیغہ راز میں نہ رکھیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چار چچا اور بہت سے چچیرے بھائی اس وقت جوان موجود تھے۔ ان سب کو خبر ہو گئی۔ یقیناً" سب نے آ آ کر حال پوچھا ہوگا۔ جب ہی تو ان میں سے ابو لہب جو پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا نبوت کا حال سن کر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پورا حال معلوم کر لینے کے بعد سخت مخالف ہو گیا۔ باقی تین چچا ابو طالب' حضرت حمزہؓ اور حضرت عباسؓ یہ تینوں گو اس وقت ایمان نہیں لائے۔ مگر مخالف بھی نہیں ہوئے۔ قرابت کی محبت باقی رکھی۔

غرض آپؐ کے دعویٰ نبوت کی خبر مکہ کے محلوں میں کافی طور پر پھیل گئی تھی۔ جس نے سنا وہ دوسروں سے کہنے لگا۔ ایک بالکل نئی بات تھی۔ خصوصا" اہل مکہ کے لئے مگر بت پرستی اور متعدد معبودوں کی پرستش چھوڑ کر صرف ایک رب العلمین کو معبود سمجھنا اور آبا و اجداد کے مذہب کو برا اور گمراہ کن سمجھنا یہ ساری باتیں عام لوگوں کو مخالف بنا دینے کے لئے کافی تھیں لہذا ہر جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مخالفانہ چرچا شروع ہو گیا۔ مگر ان میں بعضے سخت ترین مخالف تھے۔ جن میں ایک ابو جہل بھی تھا۔ اس نے خانہ کعبہ کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھا۔ تو سخت برہم

ہوا[1]۔ اور بڑی سختی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز سے روکا[2]۔ تو سورہ علق کی باقی آیتیں اتریں۔ جن میں ابو جہل کی اس شرارت کا ذکر کیا گیا ہے۔

"ارایت الذی ینھی عبدا اذا صلی"

"کیا تم نے اس کو بھی دیکھا جو ایک بندے کو روکتا ہے۔ جب وہ نماز پڑھنے لگے"۔

---

[1] ایک بار کا واقعہ اہل سیر لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار خانہ کعبہ کے سامنے نماز پڑھ رہے تھے۔ حرم شریف میں مشرکین قریش کی ایک جماعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی اداؤں کو دیکھ رہی تھی۔ اور سب باہم مضحکہ کر رہے تھے۔ ابوجہل کو یاد آگیا کہ قریب ہی میں اونٹ ذبح ہوا ہے۔ اس کی اوجھڑی پڑی ہے۔ دوڑ کر وہاں سے اوجھڑی اٹھا لایا۔ حضور سجدے میں تھے۔ اس ملعون نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن پر اوجھڑی رکھدی اور پھر سب قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔ کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر خبر پہنچا دی تو آپؐ کی صاحبزادیوں میں سے حضرت زینبؓ اور حضرت رقیہؓ نے آکر اس اوجھڑی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت مبارک سے نیچے گرا دیا۔ اور ان مشرکین کو لعنت ملامت کی۔ بعض لوگوں نے حضرت فاطمہؓ کا نام لکھا ہے مگر یہ اس وقت بہت کم سن تھیں۔ اونٹ کی اوجھڑی جیسی وزنی چیز اٹھانا ان کے بس سے باہر تھا۔ وہ اوجھڑی کو کھسکا بھی نہیں سکتی تھیں۔ عموما" اہل تاریخ و سیر چونکہ شیعہ تھے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں میں سے ہر موقعہ پر صرف حضرت فاطمہؓ ہی کا ذکر کرتے ہیں اور دوسری صاحبزادیوں کا ذکر ہی نہیں کرتے اور بعض تو صرف حضرت فاطمہؓ ہی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کہتے ہیں اور باقی تینوں کو حضرت خدیجہؓ کے پہلے خاوند کی بیٹیاں کہتے ہیں۔ حالانکہ شیعہ سنی سب کی حدیث کی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چاروں صاحبزادیوں کا ذکر موجود ہے۔ قرآن مجید میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ کو مخاطب کرکے " قل لا زواجک و بناتک۔ (سورہ احزاب آیت ۵۹) بصیغہ جمع فرمایا گیا ہے۔ بعضے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تین صاحبزادیاں بعثت سے قبل کی تھیں۔ اور حضرت فاطمہؓ بعثت کے بعد پیدا ہوئی تھیں۔ اگر ایسا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دوش مبارک سے اوجھڑی ہٹانے میں حضرت فاطمہؓ کا نام کیوں لیتے ہیں۔ اوجھڑی والا واقعہ تو بعثت ہی کے سال کا ہے۔ غرض اس فرقہ کی بنیاد ہی غلط بیانی' اختراع اور ناحق غلو اور بلاوجہ تعصب پر ہے۔ دو چار افراد کے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۴ پر

غور کیجئے اگر کوہ حرا پر سورہ عنکبوت والی آیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نہیں اتری تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اقم الصلوۃ کا وہاں حکم نہیں ہوا تھا اور حضرت جبرئیل کی وساطت سے غیر قرآنی وحی کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھنے کا طریقہ کوہ حرا ہی پر نہیں بتایا گیا تھا تو وہاں سے آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر پر اور گھر سے باہر نکل کر کعبہ کے سامنے وہ نماز کیسے پڑھنے لگے تھے جو قرآن کی زبان اور اسلام کی اصطلاح میں صلوۃ کہلاتی ہے؟ جو روکنے والا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو روک رہا تھا۔؟

بقیہ حاشیہ ــــــ

سوا جملہ قرابتداران نبوی اور صحابہ کرامؓ سے بغض و عناد پر ان کے مذہب کا دار مدار ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اگر محبت ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جملہ اولاد اطہار سے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب نسبی وسسری رشتہ داروں سے محبت ہونی چاہئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی نواسی حضرت زینبؓ کی بیٹی حضرت امامہؓ جن سے حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد حضرت فاطمہؓ کی وصیت کے مطابق نکاح کرلیا تھا۔ ان کا نام بھی یہ لوگ کبھی نہیں لیتے حضرت امامہؓ کے بھائی حضرت زینبؓ کے بیٹے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے پہلے اور بڑے نواسے حضرت علیؓ زینبی کا کہیں بھولے سے بھی کوئی ذکر نہیں کرتا، فتح مکہ کے دن یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سواری پر پیچھے بیٹھے مدینے سے مکہ پہنچے تھے اور انہی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوش مبارک پر چڑھا کر کعبہ کی دیواروں سے لگے ہوئے بتوں کو گرایا تھا یہ حضورؐ کے بڑے نواسے علیؓ زینبی تھے۔ حضرت علیؓ بن ابی طالب کے ساتھ یہ واقعہ غلط مشہور کیا گیا ہے ایک جوان آدمی کو دوش مبارک پر چڑھانا قرین قیاس بھی نہیں ہے۔

؎ برہمی کی بڑی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حرم کعبہ میں بھی بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھ رہے تھے۔ اور مشرکین مکہ کو یہودیوں سے تعصب کی وجہ سے بیت المقدس سے بھی تعصب تھا۔ کعبہ مکرمہ کی طرف رخ ہوتا تو اس میں ان کے بت رکھے ہوئے تھے۔ وہ سمجھ سکتے تھے کہ ان کے قیام و رکوع و سجود تو ہمارے بتوں کی طرف رخ کرکے ہیں۔

نماز کے دوسرے دور کی صبح صادق

اللہ تعالی عالم الغیب ہے۔ اپنے بندوں اور ان کی فطرت کا خالق بھی وہی ہے۔ اس نے خود نماز کے بارے میں فرمایا ہے۔

وانها لكبيرة الا على الخاشعين

"نماز انسان کے نفس پر بہت گراں ہوتی ہے۔ مگر جو اللہ تعالی کے ساتھ گرویدگی رکھنے والے ہیں ان پر گراں نہیں ہوتی۔"

اور دلوں میں گرویدگی اور کیفیت خشوع پیدا ہوتے ہوتے ہوتی ہے۔

پھر اللہ تعالی کو یہ بھی معلوم تھا کہ مشرکین مکہ مسلمانوں کو اور خود رسولؐ کو کس کس طرح ستائیں گے۔ علانیہ نماز پڑھنے کا موقع مومنین کو برسوں تک نہیں ملے گا۔ اس لئے اللہ تعالی نے سب سے پہلے رسول اللہؐ پر نماز فرض کی۔ پھر رسولؐ کے اہل و عیال پر، پھر جو لوگ ایمان لاتے گئے ان پر۔

پہلے نماز کے لئے کوئی وقت معین نہیں فرمایا گیا اور نہ کسی طرح کی پابندی عائد کی گئی رات دن میں ایک ہی بار کوئی پڑھ لے کوئی مضائقہ نہیں ایک بار دن کو ایک بار رات کو پڑھے یا کئی بار پڑھے۔ مالک کے ساتھ جس بندے کی گرویدگی جتنی بار مالک کے سامنے لاکھڑا کرے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جماعت بندی کرکے پڑھیں یا جس کو جہاں اور جب موقع مل جائے پڑھ لے غرض کسی طرح کی پابندی شروع میں مومنین پر عائد نہیں کی گئی۔ رفتہ رفتہ پابندیاں بڑھائی گئیں۔ وقت کی پابندی بھی رفتہ رفتہ بڑھی۔ نمازوں کی تعداد بھی آہستہ آہستہ بڑھی۔

لا يكلف الله نفسا الا وسعها

"اللہ تعالی کسی کو اس کی قوت برداشت سے زیادہ (ذمہ داری کی) تکلیف نہیں دیتا۔"

حکم نماز کی دوسری آیت :۔

پہلی آیت تو کوہ حرا پر آچکی تھی جس میں صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو نماز کا حکم ہوا تھا۔ اب دوسری آیت اتری جو بعثت کے بعد گھر پر اترنے والی پہلی آیت نماز کے متعلق تھی۔

وامر اھلک بالصلوۃ واصطبر علیھا (سورہ طٰہٰ آیت ۱۳۲)

"اے نبی تم اپنے خاص لوگوں کو نماز کا حکم دو اور خود بھی نماز کی پابندی میں ثابت قدم رہو۔"

"اہل" کا لفظ اگر کسی ایک مرد کی طرف مضاف ہو تو عموماً" اس سے اس کی بیوی مراد ہوتی ہے۔ جیسے حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام کے واقعہ میں مذکور ہے۔

اذرا نارا فقال لاھلہ امکثوا انی انست نارا (سورہ طٰہٰ آیت ۱۰)

حضرت موسیٰ نے آگ دیکھی تو اپنی بیوی سے کہا کہ ٹھہرو! میں آگ کی سن گن پا رہا ہوں۔ (۲۰ : ۱۰)

اور اگر بیت کے لفظ کے ساتھ یعنی اہل البیت کہا گیا ہو تو اس وقت یقیناً" بیوی ہی مراد ہوتی ہے جیسے سورۃ احزاب کی آیت ۳۱ میں خاص ازواج رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل البیت کہہ کر مخاطب فرمایا گیا۔ اور سورۃ ہود کی آیت ۵۳ میں خاص حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ السلام کی بیوی کو اہل البیت کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے مگر محاورہ عرب کے مطابق اہل کے لفظ یا اہلبیت کے لفظ سے کسی کی بیویاں یا صرف ایک بیوی بھی مراد ہو۔ جب بھی اس کی طرف ضمیر جمع مذکر ہی کی پھرے گی۔ مونث کی ضمیر نہیں پھرے گی۔ جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کے واقعہ سے متعلق متذکرہ آیت میں "امکثوا" کا لفظ ہے کہ یہ "اہل موسیٰ" کے لئے لایا گیا ہے۔ اور یہاں اہل سے مراد یقینی طور پر حضرت موسیٰؑ کی بیوی ہیں۔ جو ایک ہی تھیں۔ اس کے باوجود "امکثوا" کا صیغہ جمع مذکر لایا گیا ہے، اور اس کی مثال اردو میں بھی موجود ہے کہ "محل" کا لفظ بیوی کے معنی میں بھی مستعمل ہے مگر بہرحال مذکر

ہی بولا جاتا ہے۔ فلاں کا پہلا محل دوسرا محل ہی کہیں گے بیوی مراد لینے کی وجہ سے پہلی محل دوسری محل نہیں بولتے۔ مگر یہاں (اھلک میں) تو صرف اہل کا لفظ آیا ہے اور صرف اہل کے لفظ سے بیوی کے ساتھ اولاد بھی اور گھر میں ساتھ رہنے والے سب کے سب بھی مراد لئے جاتے ہیں۔ مگر گھر کے باہر اہل قرابت، اہل جوار اہل خاندان یہاں تک کہ دوست احباب، حمایتی سب مراد لئے جا سکتے ہیں۔

زوجین کے درمیان اگر جھگڑا ہو تو حکم ہے۔

فابعثوا حکما من اھلہ وحکما من اھلھا (سورۃ النساء آیت ۳۵)

یعنی ایک حکم مرد کے حمایتوں میں سے اور ایک حکم عورت کے حمایتوں میں سے کھڑا کرکے دونوں کا جھگڑا چکالو۔

صرف قرابتمند ہونا ضروری نہیں۔ زن و شو دونوں اگر ایک ہی دادا کے پوتے اور پوتی ہوں۔ تو قرابتمند دونوں کے ایک ہی ہوں گے۔ اصل مقصد حمایتوں سے ہے۔

حضرت نوح علی نبینا وعلیہ السلام نے اپنے بیٹے کو **ان ابنی من اھلی** (سورہ ھود آیت ۴۵) فرمایا تھا "یہ میرا بیٹا ہے۔ میرے اہل میں سے ہے۔" (۱۱ : ۴۵) تو فرمایا گیا **انہ لیس من اھلک** (سورہ ھود آیت ۴۵) "وہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہے۔" (۱۱: ۴۵)

ازروئے لغت اہل اور آل ایک ہی مادہ کے دونوں لفظ ہیں۔ ہائے ہوز الف سے بدل گئی ہے۔ اس لئے اہل اور آل کے معنی ایک ہی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

"من سلک علی طریقتی فھو آلی" (الحدیث)

جو میرے طریقے پر چلا وہ میری آل میں سے ہے۔

اس لئے سارے صحابہ آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اور سارے سچے مومنین آل رسول ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ **واغرقنا آل فرعون** (سورۃ البقرہ آیت ۵۰) "ہم نے آل فرعون کو غرق کردیا" (۲: ۵۰) ظاہر ہے کہ مراد اس کا لشکر ہے یعنی فرعون کے پیرو اور اس کا ساتھ دینے والے

غرق کئے گئے تھے اور وہ سب کے سب اولا" تو صرف فرعون کی اولاد نہ تھے اور ثانیا (جو کاٹنے کی بات ہے' وہ) یہ کہ فرعون لاولد مرا۔ آج بھی فرعون کی یادگار قائم کرنے والے اور فرعون کی طرف اپنے کو منسوب کرنے میں فخر کرنے والے آل فرعون ہیں۔ (لفظ اہل کی تحقیق تمام ہوئی۔)

تو جب یہ سورۃ طٰہٰ والی آیت اتری تو آپؐ نے اپنی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہؓ کو اپنی صاحبزادیوںؓ کو اپنے متبنیٰ زیدؓ بن حارثہ کو حکم دیا تھا۔ جو لوگ بالغ تھے وہ سب نماز پر مامور ہوگئے۔ بن شعور والے حضرت علیؓ بھی تھے سب کو نماز پڑھتے دیکھ کر یہ بھی ساتھ نماز پڑھنے لگے۔

گھر سے باہر:۔

حضرت ابوبکرؓ کے کانوں تک جب یہ خبر پہنچی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی و رسول ہونے کا دعوی ہے۔ تو فورا" بارگاہ نبوت میں پہنچ گئے اور پوچھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کچھ باتیں سن رہا ہوں۔ اس کی کیا حقیقت ہے۔ حضور کو اس وقت تک باہر والوں کے سامنے تبلیغ کا حکم تو نہیں ہوا تھا۔ مگر کوئی باہر کا آدمی خود آکر حقیقت حال پوچھے تو چھپانے کی بھی ممانعت نہ تھی۔ اس لئے بعنت تبلیغ نہیں بلکہ بیان واقعات کے طور پر سوال کے جواب میں آپؐ نے پورا حال کہہ دیا جو وحی اس وقت تک آئی تھی وہ بھی سنادی۔ حضرت ابوبکرؓ پر ابھی ایمان لانا فرض نہیں ہوا تھا جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تبلیغ فرض نہ ہو۔ کسی پر ایمان لانا فرض نہیں ہوسکتا۔ مگر حضرت ابوبکرؓ بلا چون و چرا ایمان لے آئے۔ دنیا میں حضرت ابوبکرؓ ہی کی ایک ایسی شخصیت ہے کہ رسولؐ پر تبلیغ فرض ہونے سے پہلے قبل اس کے کہ ایمان لانا ان پر فرض ہو ایمان لائے کسی نبی پر ایسا ایمان لانے والا کوئی نہ ہوا۔ رضی اللہ عنہ۔ حضرت ابوبکرؓ سے پہلے باہر سے آکر حال پوچھنے والے تو خود آپؐ کے چچا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچیرے بھائی اور بعض دوسرے اہل قرابت اور مکہ مکرمہ کے متعدد لوگ

تھے۔ مگر حضرت ابوبکرؓ سے پہلے کوئی باہر کا آدمی ایمان نہیں لایا۔ ایمان لانے کے بعد حضرت ابوبکرؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے اٹھے تو سیدھے حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچے۔ حضرت عثمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد تھے۔ حضرت ابوبکرؓ سے پہلے ان کو اپنی بیوی حضرت رقیہؓ بنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے پوری خبر مل چکی ہوگی اور وہ اپنی بیوی کو گھر پر نماز پڑھتے بھی دیکھتے ہوں گے قرآن مجید کا تھوڑا ہی سا حصہ تو اس وقت اترا تھا جو حضرت رقیہؓ سے سن چکے ہوں گے۔ دل میں ایمان اپنی جگہ بنا چکا تھا۔ دعوت تبلیغ کے منتظر ہی تھے۔ حضرت ابوبکرؓ سے یہ سن کر کہ وہ ایمان لاچکے ہیں۔ فورا" ان کے سامنے اپنے ایمان کا اقرار کردیا۔ وہاں سے حضرت ابوبکرؓ اٹھے اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص پھر حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف' پھر حضرت طلحہؓ پھر حضرت زبیرؓ کے پاس یکے بعد دیگرے پہنچے گئے اور تبلیغ کرتے گئے۔ یہ سب قدوسی حضرات ایمان لے آئے تو ان سب کو لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے جس طرح کوئی باپ مدت کے بچھڑے ہوئے اپنے بیٹوں سے ملے۔ اسی شفقت و محبت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ملے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع نہیں کیا گیا تھا کہ باہر کے لوگ ایمان لے آئیں تو ان کے ساتھ کیا کیا جائے فورا" آیت اتری۔

وانذر[1] عشیرتک الاقربین واخفض جناحک لمن اتبعک من المومنین۔
(سورہ الشعراء آیت ۲۱۴۔ ۲۱۵)

---

[1] فانذر عشیرتک الاقربین فرمایا گیا فبلغ یا فادع نہیں فرمایا گیا اس لئے کہ چاروں چچا اور بہت سے چچیرے بھائی حضورؐ کی نبوت اور حضور کی دعوت سے پوری طرح واقف ہوچکے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خود بالمشافہ باتیں کرچکے تھے۔ طبری کی تاریخ جلد دوم میں مذکور ہے کہ حضور نے بنی ہاشم کے جملہ افراد کو یکجا کرکے دعوت دی۔ اور نہایت موثر انداز میں بڑی محبت و ہمدردی کے لہجے میں لوگوں کو سمجھایا مگر ایک شخص بھی ایمان نہ لایا۔ حضور کی زبان مبارک سے قرآنی آیتیں سننے کے بعد بھی مطلق متاثر نہ ہوئے۔ مگر ایک دوسرے شخص کی دعوت و تبلیغ سن کر کچھ سعادتمند لوگ حضورؐ کی زبان مبارک سے کچھ سنے بغیر ایمان لے آئے جن میں دو بنی امیہ کے دو بنی زہرہ کے اور دیگر مختلف قبائل کے لوگ ایمان لے آئے مگر خاص خاندان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے افراد بنی ہاشم میں اب تک حضرت علیؓ اور حضور کی دو صاحبزادیوں کے سوا کوئی فرد ایمان نہ لایا۔ اس لئے "وانذر" فرمایا

بقیہ حاشیہ صفحہ [illegible] پر

"اپنے قریب تر رشتہ داروں کو (نتیجہ کفر و مخالفت سے) ڈراؤ اور جو مومنین تمہاری پیروی کرنے پر آمادہ ہوں ان کے ساتھ شفقت و محبت کا برتاؤ رکھو۔" (۲۶: ۲۱۴۔ ۲۱۵)

حضرت ابوبکرؓ کی یہ دوسری خصوصیت تھی جو دنیا میں کسی دوسرے کو حاصل نہ ہوئی، کہ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی باہر کے لوگوں میں تبلیغ کی اور یوں سمجھئے کہ خلافت نبوی حضرت صدیق اکبرؓ کے لئے اسی دن سے قائم ہوگئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں رسول اللہؐ کے دین کی تبلیغ کی اور رسولؐ کے نائب کے ہاتھ پر دو دن میں آٹھ آدمی مشرف بہ اسلام ہوئے۔ قبل اس کے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم خود باہر نکل کر تبلیغ کے لئے مامور ہوں۔ صلی اللہ تعالی علی نبیہ وعلی خلفائہ وعلی اصحابہ وبارک وسلم۔

دوسرے دن پھر حضرت ابوبکرؓ تبلیغ کے لئے نکلے ابن جریر نے حضرت صدیق اکبرؓ کی تبلیغ سے آٹھ صحابہ کے مشرف بہ اسلام ہونے کا ذکر کیا ہے مگر نام انہی پانچ کے لکھے ہیں۔ جن کا میں نے ابھی ذکر کیا اور یہ پانچوں عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ حاجی معین الدین ندوی مرحوم نے اپنی کتاب خلفائے راشدین میں حضرت عثمانؓ بن مظعون حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح، حضرت ابوسلمہؓ اور حضرت خالدؓ بن سعید بن العاص کے نام بھی ان پانچ بزرگوں کے علاوہ لکھے ہیں۔ میرا گمان ہے کہ حضرت ابو ذر غفاریؓ، حضرت عمروؓ بن عبسہ، حضرت بلال بن ابی رباح اور حضرت ارقمؓ بن ابی الارقم اور حضرت صہیبؓ اور حضرت مقدادؓ، حضرت عمارؓ بن یاسر کہ یہ حضرات بھی حضرت صدیق اکبرؓ ہی کی تبلیغ سے نعمت اسلام سے متمتع ہوئے ہوں کیونکہ ان سب کا اسلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے باہر نکل کر تبلیغ کرنے سے قبل ہے۔ اور باہر تو عام طور سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہی پروپیگنڈا ہو رہا تھا۔ بس صرف حضرت صدیق اکبرؓ ہی تھے جو لوگوں سے فرداً" مل کر تبلیغ کر رہے تھے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

گیا۔ حضرت علیؓ تو حضورؐ کے زیر تربیت ہی تھے۔ اور کمسن نے صاجزادیاں بچی ہی تھیں۔ گھر کے لوگ تو پہلے ہی سے مطیع تھے۔ مطیع رہے کوئی چنداں اہم بات نہ ہوئی۔ غیر لوگ جو باہر والے ایمان لے آئے اور سراطاعت خم کردیا ان کا ایمان لانا اہم تھا اس لئے جب وہ ایمان لائے تو یہ آیت نازل ہوئی

مومنین کو نماز کا حکم:۔

اب چونکہ حضرت صدیق اکبرؓ اور یہ سارے مومنین اہل رسول اور آل رسول ہوگئے اور حکم تھا وامر اھلک بالصلوۃ اپنے خاص لوگوں کو نماز کا حکم دو۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب مومنین کو نماز کا حکم دے دیا۔ اور جس طرح وحی جبرئیل کے ذریعے آپؐ کو نماز کے ارکان و اذکار بتائے گئے تھے آپؐ نے ان سب کو بتائے مگر ان چند مخلصین کے قبول اسلام کی خبر سن کر مشرکین کا غصہ اور بڑھ گیا تھا۔ اس لئے کوئی مسلمان علانیہ نماز نہیں پڑھ سکتا تھا اس لئے نہ نماز کا کوئی وقت مقرر کیا گیا نہ اس کے لئے کوئی جگہ متعین کی گئی۔ جس کو جس وقت جہاں موقعہ مل جاتا تھا نماز پڑھ لیتا تھا اور اپنے گھر پر مومن نماز پڑھتا تھا۔ جس وقت اس کے دل میں اللہ تعالی کے ساتھ ولولہ گرویدگی پیدا ہوتا تھا کچھ دن کے بعد جب دار ارقم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ کے ساتھ بیٹھ کر وعظ و پند فرمانے لگے۔ قرآن مجید کی جو آیتیں اتری تھیں ان کی تعلیم فرماتے تھے تو وہاں ان مٹھی بھر مومنین کو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں نماز پڑھنے کا موقعہ بھی مل جاتا تھا۔ اسی زمانے میں سورۃ معارج کا نزول ہوا تھا۔ چونکہ اس وقت تک ۲۴ گھنٹے میں ایک ہی نماز فرض تھی۔ اس لئے اس سورۃ میں والذین ھم علی صلاتھم یحافظون (سورۃ معاج آیت ۳۴) بصیغہ واحد (صلاتھم) ہے مگر سورۃ مومنون اس وقت اتری ہے جب چار وقت کی نماز فرض ہوئی تھی۔ اس لئے سورہ مومنون آیت ۹ میں ہے والذین ھم علی صلوتھم یحافظون (سورۃ مومنون آیت ۹) یعنی بصیغہ جمع صلوات کا لفظ آیا ہے۔

نماز کا دوسرا دور

تقریباً" تین برس کے بعد آیت اتری

واصبر لحکم ربک فانک باعیننا وسبح بحمد ربک حین تقوم ومن اللیل فسبحہ وادبار النجوم۔ (سورۃ الطور آیت ۴۸۔۴۹)

"اے رسول تم اپنے رب کے فیصلے کے مطابق ثابت قدم رہو (تم اپنے رب کے فیصلے کا ثابت قدمی سے انتظار کرو۔ اور گھبراؤ نہیں) یقین رکھو کہ تم ہماری نگہداشت میں ہو اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو۔ جس وقت تم سو کر اٹھو اور رات کے کسی وقت اور جب ستارے پچھلے پاؤں پھرنے لگیں (مائل بغروب ہونے لگیں)" (۵۲: ۴۸۔۴۹)

پہلے دور کو دو دور کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ چند دنوں کا دور جب صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی تنہا نماز پڑھتے تھے اور دوسرا دور وہ جس میں اپنے خاص لوگوں کو بھی نماز کی تبلیغ کا حکم ہوا تھا۔ مگر میں نے دونوں دوروں کو ایک ہی دور قرار دیا اس لئے کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بلا قید وقت و بلا قید تعداد نماز فرض تھی۔ کم سے کم چوبیس گھنٹے میں ایک بار بھی نماز پڑھ لینا کافی تھا۔ جس کو جس وقت موقعہ ملے جس وقت جی چاہئے پڑھ لے۔ یہ آزادی کا ایک دور رہا۔ اس دور کے ابتدائی حصے میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نماز کا حکم تھا۔ دوسرے حصے میں سب مومنین کے لئے نماز کا حکم ہوا۔ بالکل اسی طرح جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تھا اور اب دوسرا دور جو تقریباً" تین برس کے بعد آیا جب بیس بائیس آدمی (مرد و عورت) سے زیادہ ایمان نہیں لائے تھے تو ہر شخص پر دو نمازیں فرض ہوئیں' ایک صبح جب سو کر اٹھے یعنی رات بسر کرکے جس وقت اٹھے ضروریات سے فارغ ہو کر دو رکعت نماز پڑھ لے پھر رات کے وقت جس وقت موقع ملے یعنی نماز پڑھ کر سوئے یا پہلے سو رہا اور رات کی نماز نہیں پڑھی تھی تو اب پھر رات کے وقت جس وقت موقع ملے پڑھ لے۔ غرض غروب آفتاب کے بعد سے ادبار النجوم یعنی نصف شب کے

گل تک پڑھ لے۔ اگر اس کا موقعہ نہ مل سکا تو کم سے کم طلوع فجر سے پہلے ضرور پڑھ لے مگر دن کی نماز رات کی نیند سو کر جس وقت بھی اٹھے طلوع آفتاب سے پہلے یا بعد تو اسی وقت ضروریات سے فارغ ہو کر نماز پڑھ لے تو اس دور میں فی الجملہ آزادی بھی اور فی الجملہ پابندی بھی مگر رات کو ایک نماز اور بھی بتائی گئی۔ ادبار النجوم کے وقت یعنی جب تارے پیچھے کی طرف یعنی مغرب کی طرف جانے لگیں۔

ادبار النجوم کے مرکب اضافی ہونے میں بہت بلیغ مفہوم ادا فرمایا گیا ہے۔ ستارے طلوع ہو کر اوپر چڑھتے آتے ہیں تو ان کا چہرہ تاباں سامنے ہوتا ہے۔ جیسے سامنے سے کوئی آرہا ہے اور جب آدمی رات کے بعد ستارے غروب ہونے کی طرف مائل ہوتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے پاؤں پھرے جا رہے ہیں کیونکہ ان کے روشن چہرے تو ہماری طرف ہیں اور ہم سے دور ہوتے جاتے ہیں جیسے کوئی آہستہ آہستہ پچھلے پاؤں کھسکتا چلا جاتا ہو اس مفہوم کو ادبار النجوم" کے لفظ نے بڑی خوبی سے ادا کر دیا ہے یہاں النجوم پر الف لام عہد کا ہے وہی نجوم مراد ہیں جن کا تسلط آسمان پر رات بھر رہتا ہے۔ غروب آفتاب کے وقت طلوع ہوتے ہیں اور طلوع آفتاب سے پہلے غروب ہو جاتے ہیں درمیان شب جو نجوم طلوع ہوتے ہیں اور اپنی سیر ادھوری چھوڑ کر طلوع آفتاب کے آثار جب ان کی نمود کو ختم کر دیتے ہیں ایسے ناکام و نامراد نجوم کا کیا اعتبار فرض ادبار النجوم کے وقت نصف شب کے بعد بھی دو رکعت نماز کا حکم ہوا تھا مگر جس وقت یہ وحی حضرت جبریل لائے تھے انہوں نے یہ بھی حضورؐ سے کہہ دیا تھا' کہ ادبار النجوم والی نماز صرف آپؐ پر فرض ہے عام مومنین بھی پڑھ سکتے ہیں مگر دوسروں پر فرض نہیں ہے یہ مخصوص فریضہ ہے آپؐ کے لئے دوسرے لوگ بھی ہر رات کو پڑھیں یا کسی کسی رات کو پڑھیں ان کو اختیار ہے بہرحال کار ثواب ہے۔

اس آیت کریمہ کے الفاظ پر غور کیجئے۔ اس کا آغاز خود بتا رہا ہے کہ یہ اس زمانے میں اتری ہے جس وقت نماز پڑھنا اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنا تھا جس کو مشرکین کبھی کہیں نماز پڑھتے دیکھ لیتے تھے اس کے جانی دشمن ہو جاتے تھے ہر ممکن طریقے سے اس کو ستاتے تھے۔ جب تک بغیر کسی پابندی کے نماز فرض تھی وہ بھی چوبیس گھنٹے میں صرف ایک وقت فرض تھی تو مشکل سے لوگ

چھپ چھپ کر نماز پڑھتے تھے اب دو وقت کی نماز ہر مومن پر فرض ہو رہی ہے اور رسول پر تین وقت کی اور فی الجملہ پابندی وقت کے ساتھ خصوصاً" دن کی نماز کہ جس وقت رات بسر کر کے سو کر اٹھے تو ضروریات سے فارغ ہو کر فوراً" نماز پڑھ لے اس پابندی کی وجہ سے تو مخالفین کی نظروں سے روزانہ چھپ چھپ کر نماز پڑھنا ضرور دشوار ہو گا نجانے کب کوئی دیکھ لے اور نماز کی حالت میں کیا شرارت کر بیٹھے اسی لئے پہلے یہ فرمایا کہ واصبر لحکم ربک "اپنے رب کے فیصلے کے لئے ثابت قدم رہو" یعنی تمہارا رب جلد ہی تمہارے اور تمہارے ہٹ دھرم مخالفین کے درمیان فیصلہ کرنے والا ہے۔ تم ثابت قدمی سے اس فیصلے کا انتظار کرو اس کے بعد اطمینان بھی دلایا کہ تم اپنی ظاہری مادی کمزوری اور قلت تعداد اور مخالفین کی قوت و کثرت کو دیکھ کر گھبراؤ نہیں تم میری نگہداشت اور میری حفاظت میں ہو۔ اس طرح اطمینان دلانے کے بعد نماز کا حکم بیان فرمایا کہ تم جس وقت رات کی نیند سو کر صبح کو اٹھو تو اس وقت نماز پڑھ لیا کرو اور رات کے بھی کسی وقت میں اور ادبار النجوم کے وقت فرض سورہ طور چاہے جس وقت بھی اتری ہو مگر اس کی آخری دو آیتیں ضرور ابتدائی آیتوں سے ہیں جو سنہ ۳ نبوی میں عام مومنین پر صرف دو رکعت کی نماز کی عام فرضیت بتانے کے لئے اور ایک نماز کی فرضیت مخصوص برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اتری تھی۔

یہ دو وقت کی نماز کا دور سنہ ۷ نبوی کے چند ماہ تک رہا سنہ ۷ نبوی میں حضرت فاروق اعظمؓ ایمان لائے اور ان سے چند ماہ پیشتر مگر سنہ ۶ نبوی میں حضرت حمزہؓ سید الشہداء ایمان لا چکے تھے ان دو اللہ کے شیروں کے ایمان لانے کی وجہ سے مومنین کی جماعت میں وہ احساس ضعف باقی نہ رہا تھا جو پہلے تھا مگر پھر بھی ہر شخص حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہؓ کو اپنے ساتھ کیسے ہر وقت رکھ سکتا تھا یا خود ان کے ساتھ ہر وقت کیسے رہ سکتا تھا۔

حضرت عمرؓ چالیسویں مسلمان تھے رضی اللہ عنہم اجمعین۔

اسی سنہ ۷ نبوی کے آخر میں غالباً" تین وقت کی نماز سب پر فرض ہوئی اور نماز کا تیسرا دور شروع ہو گیا۔

نماز کا تیسرا دور

سنہ ۷ھ نبوی سے

نماز کے متعلق چوتھی آیت کریمہ

فاصبر علی مایقولون وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل الغروب ومن اللیل فسبحہ وادبار السجود○ (سورہ ق آیت ۳۹ ـ ۴۰)

"مخالفین (جو کچھ) تمہارے خلاف بولتے ہیں اس پر صبر کرو (ضبط سے کام لو) اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو[1] (نماز پڑھو) طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب سے پہلے اور رات کے کسی وقت میں اور رات کی سب نمازوں کے بعد۔" (۵۰: ۳۹ ـ ۴۰)

---

[1] تسبیح و صلوۃ ۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں تسبیح کا لفظ بھی نماز کے معنی میں خصوصاً" بصیغہ امر برابر آیا ہے۔ بلکہ اہل عرب بھی نماز کے لئے تسبیح کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں احکام نماز کی بعض آیتیں صلوۃ کے لفظ کے ساتھ آئی ہیں۔ بعض تسبیح کے لفظ کے ساتھ اس لئے نماز سے پیچھا چھڑانے والے بعض نام نہاد و اعیان قرآن تسبیح کے لفظ کے ساتھ جو آیتیں آئی ہیں ان میں حکم نماز تسلیم کرنے سے گریز کرتے ہیں اور جن وقتوں میں تسبیح کا حکم ہے ان وقتوں میں صرف سبحان اللہ وبحمدہ ایک بار زبان سے کہہ لینا کافی قرار دیتے ہیں یہ نتیجہ صرف ملحدانہ ذہنیت کا ہے جن وقتوں میں تسبیح کے لفظ سے حکم ہے انہی وقتوں میں دوسری آیت میں صلوۃ کے لفظ سے بھی حکم موجود ہے۔ وہ سب آیتوں کو ملا کر غور کب کرتے ہیں؟ وہ تو جو کہتے ہیں وہ بھی کبھی نہیں کرتے۔ ایسا کہنے والوں کی قسم پر بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ورنہ ان سے قسم کھلوا کر پوچھا جاتا کہ کیا وہ ان وقتوں میں پابندی کے ساتھ ایک وقت بھی روزانہ صدق دل سے تعمیل حکم سمجھ کر سبحان اللہ وبحمدہ کہنے کے پابند ہیں' وہ تو صرف بحث کرنے کے وقت ایسا بول دیتے ہیں یا کسی مضمون میں لکھ دیتے ہیں۔ درحقیقت وہ اللہ تعالی کو معبود ہی نہیں سمجھتے بلکہ اللہ تعالی ہی پر ان کا صحیح ایمان نہیں ہے۔ ایسے لوگوں سے نماز کے موضوع پر بحث کرنا غلط ہے۔ ان سے پہلے اللہ تعالی کے وجود پر بحث ہونی چاہئے وہ جب وجود باری تعالی کو تسلیم کر لیں تو اس کی معبودیت پر بحث ہونی چاہئے۔ اس کے بعد یہ بحث ہو کہ اللہ تعالی کی عبادت کس طرح کی جائے؟ اتنے مراحل طے کرنے کے بعد ان سے نماز پر بحث ہو سکتی ہے۔ وہ بھی اس شرط پر کہ ..

بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۶ پر

اس آیت میں دن کی دو نمازیں بتائی گئیں ایک دن کے آغاز میں دوسری دن کے اختتام میں۔ مگر آیت کریمہ میں دونوں نمازوں کے آخری وقت بتائے گئے ابتدائی وقت کسی کے بھی نہیں بتائے گئے قرآن مجید کا یہی اسلوب بیان ہے کہ جو بات فحوائے کلام سے سمجھی جائے یا پہلے جس کو بیان کیا ہے اس کا ذکر چھوڑ دیا گیا ہے۔ احکام کی آیتوں میں یہ انداز بیان خصوصیت کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے تاکہ لوگوں کو غور و فکر کرنے کی ضرورت محسوس ہو اور تفقہ کا ڈھنگ معلوم ہو جائے۔

دن کے اول وقت کی نماز کے وقت کا آغاز تو اس سے پہلے والی آیت میں بتا دیا گیا ہے حین تقوم فرما کر یعنی جس وقت رات بسر کرکے صبح کو اٹھو تو پہلے آزادی تھی کہ جس وقت بھی نیند ٹوٹے چاہے طلوع آفتاب ہی کے وقت جب بھی نیند ٹوٹے نماز پڑھ لی جائے اب قبل طلوع الشمس فرما کر مسلمانوں کو سحر خیزی کا بھی پابند کر دیا گیا۔ اب ہر مسلمان پر فرض ہو گیا کہ وہ صبح کو ایسے وقت اٹھے کہ طلوع آفتاب سے پہلے دن کی پہلی نماز پڑھ لے نماز ہی فرض نہ ہوئی سحر خیزی بھی فرض ہو گئی۔

بقیہ حاشیہ

قرآن مجید و وحی منزل من اللہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول اللہ تسلیم کر چکے ہوں ورنہ پہلے رسول اللہ کو رسول اللہ اور قرآن کو کتاب اللہ ان سے تسلیم کرا لیا جائے ورنہ نماز کی بحث ان سے کبھی طے نہیں ہو سکتی۔ مگر یہ ساری بحثیں نتیجہ خیز جب ہو سکتی ہیں کہ جانبین انصاف و دیانت کے ساتھ حقائق حق کی نیت سے بحث کریں ورنہ ہٹ دھرمی کو اپنا شعار بنانے والوں سے بحث کرنا اپنا وقت ضائع کرنا ہے۔

جو رات کو نہیں سویا

جو رات بھر جاگا ہے یا آدھی رات سے جاگ رہا ہے وہ طلوع فجر یعنی پو پھٹنے کے بعد طلوع شمس سے قبل تک کے اندر کسی وقت نماز پڑھ لے گا اس لئے کہ یہ دن کی پہلی نماز ہے اور دن شروع ہوتا ہی ہے طلوع فجر سے اس کو ہر شخص جانتا ہے اسی لئے اس نماز کا نام بھی صلوۃ الفجر رکھا گیا اور روزے کی ابتداء بھی پو پھٹنے ہی سے ہوتی ہے۔ مگر آغاز صوم کی آیت بھی سورہ بقرہ مدنی سورت کی ہے اور صوم فرض بھی مدینہ منورہ میں ہوا اور صلوۃ الفجر کا لفظ بھی سورہ نور مدنی سورہ میں ہے اور پردہ کا حکم بھی جس میں یہ لفظ آیا ہے مدینہ طیبہ ہی میں ہوا تھا تو مدنی آیتیں مدنی سورتوں میں جو آئی ہیں ان سے ہجرت کے قبل مکہ معظمہ میں اس حکم صلوۃ کی چوتھی آیت کے نزول کے وقت کس طرح تصریف آیات کے ذریعے نماز کے مسائل اور اس کے طریقے تصنیف کئے جاتے؟

البتہ رات کی انتہاء سورۃ القدر میں "حتی مطلع الفجر" فرما کر بتا دی اور سورہ قدر یقیناً" مکی ہے اگرچہ ثعلبی نے اس کو مدنی ثابت کرنیکی کوشش کی ہے مگر بتقاضائے فطرت کہ اختلاف آفرینی و اختلاف پسندی ہے دن کس وقت سے شروع ہوتا ہے اور کس وقت ختم ہوتا ہے اور رات کس وقت سے شروع ہوتی ہے اور کس وقت ختم ہوتی ہے اس کو قرآن مجید کی آیتوں میں تلاش کرنا دیوانہ پن ہی ہے۔

مختصر یہ ہے کہ دن کی پہلی نماز کا وقت دن کے آغاز پو پھٹنے کے وقت سے شروع ہو جاتا ہے مگر ہر شخص جس وقت سو کر اٹھتا ہے اسی وقت نماز فجر کا تہیہ کرتا ہے عمل ہر شخص کا حین تقوم کے مطابق ہوتا ہے اگرچہ دن کی پہلی نماز کا وقت درحقیقت طلوع فجر یعنی پو پھٹنے ہی سے ہوتا ہے۔

باقی رہی دن کی دوسری نماز کے وقت کی ابتداء تو اس کا پتہ دو طرح لگایا جاتا ہے ایک یہ کہ اول وقت کی انتہا قبل طلوع الشمس بتائی گئی ہے اور اس کی ابتدا ایسے وقت سے ہوتی ہے جس وقت طلوع الشمس کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں۔ تو بالکل اسی طرح قبل غروب والی نماز کے وقت کی ابتدا اس وقت سے ہونی چاہئے کہ آثار غروب آفتاب فضا میں پیدا ہونا شروع ہو جائیں اول وقت کی ابتدا پو پھٹنے سے تھی تو آخر وقت کی ابتداء

زردی و اضمحلال شمس سے ہونی چاہئے۔ جب فضا میں آفتاب کی تمازت کا اثر کم ہوجائے دوسری صورت یہ ہے کہ مثلاً "ڈھاکہ میں یکم جنوری کو پوپھٹتی ہے پانچ بج کر بیس منٹ پر اور آفتاب طلوع ہوتا ہے چھ بجکر اکتالیس منٹ پر تو دن کے اول وقت کی نماز کا وقت ایک گھنٹہ بیس منٹ تقریباً" مل جاتا ہے اسی انداز سے دن کے آخری وقت کی نماز کا وقت بھی غروب آفتاب سے ایک گھنٹہ بیس منٹ یا ڈیڑھ گھنٹہ پہلے رکھنا چاہئے اس ایک گھنٹہ بیس منٹ کے اندر دن کی دوسری نماز کا وقت سمجھنا چاہئے یعنی یکم جنوری کو پانچ بجکر پچیس منٹ پر غروب آفتاب ہو تو چار بجکر پانچ منٹ سے غروب آفتاب تک اندر دن کے آخری وقت کی نماز پڑھ لینی چاہئے۔ یعنی عصر کی نماز کا وقت (واضح رہے یہ تیسرے دور کا ذکر ہے جب ظہر کی نماز فرض، نہیں ہوئی تھی) مگر رات کی نماز سب لوگوں کے لئے تو وہی ایک ہی وقت کی رہی اسی آزادی کے ساتھ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو ایک ادبار النجوم والی فاضل نماز فرض تھی وہ بھی اسی طرح حضورؐ پر فرض رہی اور دوسروں کے لئے بھی تطوع یعنی نفل کی حیثیت سے پڑھنا باعث ثواب مزید رہا۔ تو رات کی دو نمازیں حضورؐ پر فرض اور ایک نماز مومنین پر فرض اور دوسری نفل رہی لیکن جتنی نمازیں بھی رات کو پڑھی جائیں سب کے بعد ایک آخری نماز بھی پڑھی جائے (ادبار السجود) سب نمازیں تو شروع سے دو دو ہی رکعت پڑھی جارہی ہیں مگر اس رات کی آخر نماز کو تین رکعت پڑھنے کے لئے حضرت جبریل نے بتایا اس لئے اس کا نام صلوۃ الوتر رکھا گیا مگر وتر[1] کو صرف رات کی آخری نماز کیوں کہا جاتا ہے؟ اس لئے کہ یہ رات دن ملا کر پورے چوبیس گھنٹے کی آخری نماز ہے اس لئے کہ رات کی تاریکی گوشہ قبر کی تاریکی

---

[1] سورہ فجر کی آیت کریمہ ۳ جو ہے "والشفع والوتر" اکثر مفسرین کے نزدیک پنجگانہ نمازوں میں سے تو ظہر، عصر اور عشاء کی نمازیں تو شفع ہیں اور مغرب کی نماز جو رات کی سب سے پہلی نماز ہے اور وتر کی نماز جو رات کی سب سے آخری نماز ہے تین تین رکعتیں وتر ہیں۔ رات کی پہلی اور پچھلی نمازوں کے وتر ہونے کی خصوصیت اور اس کے مصالح تو وہی جانتا ہے جس نے اس کا حکم فرمایا بندوں کا کام تعمیل حکم ہے نہ کہ حکم کے اسباب و علل پوچھنا۔

کے مشابہ ہے اور نیند کو مجازی موت غلط نہیں کہتے۔ قرآن مجید میں ہے۔

اللہ یتوفی الانفس حین موتها والتی لم تمت فی منامها (سورۃ الزمر آیت ۴۲)

"اللہ تعالی روح نفسانی کو انسان سے پورا نکال لیتا ہے اس کی موت کے وقت اور جس کی موت نہیں ہوتی تو اس کی روح نفسانی کو نیند کی حالت میں نکال لیتا ہے۔" (۳۹ : ۴۲)

تو سونے والا جب سوکر اٹھتا ہے تو گویا نئی زندگی اس کو ملتی ہے اس نئی زندگی میں پہلی نماز اس کو صبح کی اور آخری نماز عشا کی پڑھنی ہے اور ادبار النجوم والی نماز تہجد بھی اس نے اگر پڑھی ہے تو یہی اس کی آخری نماز ہوئی۔ اس کے بعد اس کو وتر پڑھ کر رات کی نماز کو ختم کرنا ہوگا اس حساب سے پورے چوبیس گھنٹوں کی نمازوں کو ملا کر سب سے آخری نماز وتر کی ہوئی جس کے بعد وہ پھر سوئے گا اور مجازی موت اس پر پھر طاری ہوجائے گی۔

تعجب ہے کہ وتر کی نماز کو کوئی سنت اور کوئی واجب کہتا ہے۔ حالانکہ یہ نص قرآنی سے فرض ہے کسی دلیل ظنی سے نہیں دلیل قطعی سے مامور بہ ہے اور یہ ہر مسلمان پر فرض ہے جس طرح پانچ وقت کی نماز فرض ہے۔ مگر یہ عشاء کی نماز کا ایک ضمیمہ ہے اس کے لئے نہ اذان ہوتی ہے نہ جماعت اس لئے عشاء کا ضمیمہ قرار پائی اس کا خاص وقت بھی معین نہیں ادبار النجوم یعنی تہجد کی نماز کی بھی پابندی نہیں ہے وہ صلوۃ العشاء کے بعد اسے پڑھ سکتا ہے جس کو صرف فرض عشاء پڑھنا ہے جیسے مسافر۔ اس آیت کریمہ کے نزول کے بعد تقریباً" ڈیڑھ برس تک تین وقت کی نماز کا معمول رہا فجر عصر اور عشاء۔ ادبار النجوم والی تہجد کی نماز تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض تھی مگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین بھی تطوعا" یعنی نفل کی حیثیت سے عموما" پڑھتے تھے رات کی آخری نماز وتر سب کے لئے تھی ہر نماز تو دو دو رکعت پڑھی جاتی تھی صرف مغرب اور وتر کی نماز تین رکعت ہوتی تھی کیونکہ یہی حضرت جبریل نے وحی ربانی سے بتایا تھا[1]

---

[1] رکعات توفیقی ہے وحی کے ذریعے بتائی گئی وحی متلو وحی غیر متلو دونوں کے ذریعے جس، کی بحث میرے مقالہ تعداد رکعات نماز پنجگانہ میں دیکھئے۔

واضح رہے

یہ بات تو یقینی ہے کہ نماز رفتہ رفتہ فرض ہوئی پہلے صرف ایک وقت کی نماز بغیر تعین وقت کے چوبیس گھنٹے میں ایک بار جس وقت موقعہ ملے۔ وہ بھی صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض ہوئی تھی اس کے بعد حضورؐ کو اپنے اہل و عیال کو بھی پابند نماز بنانے کا حکم ہوا اہل کے لفظ میں جو معنوی عموم ہے اس کے اعتبار سے جب باہر والے ایمان لا لا کر اہل رسول اللہؐ میں داخل ہوتے گئے تو وہ بھی پابندی نماز پر مامور ہوتے گئے۔ اس کے بعد دو وقت کی نماز عامہ مومنین پر فرض ہوئی پھر تین وقت کی نماز فرض ہوئی مگر رات کی نماز کا ایک مختصر سا ضمیمہ آخری نماز بھی عموی فرض قرار پائی جو سب نمازوں کے بعد پڑھی جائے جس کا نام وتر رکھا گیا اس کے بعد چار وقت کی اور پھر ہجرت الی المدینہ کے اثنائے راہ میں یعنی ہجرت کے بعد مگر مدینہ طیبہ پہنچنے سے پہلے مقام قباء میں پانچوں وقت کی نماز فرض ہوئی آیتیں اسی مناسبت سے اتریں جن کو مختلف سورتوں میں حسب منشائے رب العالمین حضرت جبریل کے بتانے کے مطابق جگہ دی گئی اسی لئے یہ دیکھنا کہ فلاں سورت کب اتری تھی اور یہ سمجھنا کہ یہ آیت نماز بھی اسی زمانے میں اتری ہوگی غلط ہے سورتوں کے اترنے کی تعیین وقت تو متاخرین نے قیاس اور محض ظن کی بناء پر قائم کی ہے میں نے بھی ایک وقت کی نماز کب تک فرض رہی اور دو وقت کی کب فرض ہوئی اور کب تک فرض رہی پھر تین وقت کی نماز کب فرض ہوئی اور کب تک فرض رہی۔ پھر چار وقت کی نماز کب فرض ہوئی اور کب تک فرض رہی اور پانچ وقت کی نماز کب فرض ہوئی۔ محض قیاس و ظن ہی پر اگلوں کی طرح اندازہ قائم کرکے زمانے مقرر کئے ہیں اسی لئے غالباً" کا لفظ برابر لکھا ہے صرف ایک نماز پھر دو پھر تین پھر چار اور پھر پانچ نمازیں جب فرض ہوئیں جو آیات قرآنیہ سے ثابت ہیں تو پھر ان کے لئے پانچ دوروں کا ہونا بھی لازمی ہے صرف ہر دور کی مدت کا تخمینہ قیاس اور ظن پر مبنی ہے مگر پانچ دور کا ہونا قیاسی و ظنی نہیں ہے پانچ دور فرضیت نماز کے تو قرآنی آیتوں کی شہادت سے ثابت ہیں اور درایت و عقل سلیم بھی

بتاتی ہے کہ ایسے سعن اور ہجوم خطرات، قلت تعداد اور کثرت مخالفین کے زمانے میں یک وقت پانچ پانچ وقت کی نماز ہرگز فرض نہیں کردی گئی ہوگی یقیناً" رفتہ رفتہ مومنین کو نماز کا خوگر بنایا گیا جیسے جیسے لوگوں میں ذوق بادت پیدا ہوتا گیا ویسے ویسے وقفہ دے دے کر نمازوں کی تعداد بڑھائی گئی۔

نماز کا چوتھا دور

حکم نماز کی پانچویں آیت کریمہ

واقم الصلوة طرفی النہار وزلفا من اللیل ان الحسنات یذھبن السیئات ط ذلک ذکری للذاکرین ○ (سورہ ھود آیت ۱۱۴)

اے رسول نماز قائم کرو دن کے دونوں کناروں میں اور رات کے کچھ حصوں میں بلاشبہ نیکیاں برائیوں کو دور کردیتی ہیں یہ ایک نصیحت ہے (اللہ تعالی کو) یاد کرنے والوں کے لئے۔ (۱۱: ۱۱۴)

نماز کے متعلق چوتھی آیت میں فرمایا گیا تھا قبل طلوع الشمس و قبل الغروب یہاں طرفی النہار فرمایا گیا دن کے دونوں کنارے وہی پوپھٹنے کے بعد سے قبل طلوع الشمس تک پہلا دن کا کنارہ اور زردی آفتاب سے لے کر قبل غروب تک دن کا آخری کنارہ اسی لئے اس آیت کے حکم سے بھی اس چوتھے دور میں دن کی وہی دو نمازیں فرض رہیں فجر اور عصر کی' رات کے وقت جب تک صرف ایک نماز فرض تھی (چاہے وہ رات کے وقتوں میں کسی وقت بھی پڑھی جائے) سابق آیتوں میں **ومن اللیل** فرمایا گیا یہاں **زلفا من اللیل** ارشاد فرمایا ہے۔ زلف زلفتہ کی جمع ہے اگر صرف ایک نماز رات کو فرض ہوتی تو یا تو سابق آیتوں کی طرح صرف ومن اللیل ہی یہاں بھی فرمایا جاتا یا زلفتہ من اللیل فرمایا جاتا یعنی رات کے کسی حصے میں۔ بعض اہل لغت زلفتہ اللیل یا زلفتہ من اللیل کے معنی لکھتے ہیں۔ رات کا ابتدائی حصہ تو رات کا ابتدائی حصہ تو ایک ہی ہوگا یہاں زلف جمع کا صیغہ آیا ہے اس لئے یا تو ابتدائی کی قید کو حذف کرکے صرف رات کے حصے مراد لیجئے یا رات کو کئی حصوں میں تقسیم کرکے ہر حصے کے ابتدائی حصے کو مراد لیجئے۔ مگر بہرحال "زلفا" بصیغہ جمع جب آیا ہے تو کم سے کم رات کے تین حصے یا تین ابتدائی حصوں میں نماز کا حکم ماننا پڑے گا اور رات کی تین نمازیں بھی ماننی ہوں گی۔ رات کا پہلا حصہ تو غروب آفتاب کے بعد والا ہوتا ہے اور دوسرا ابتدائی حصہ غروب شفق کے بعد ہوتا ہے یہ دو ابتدائی حصے تو واضح ہیں اور

تیسرا ابتدائی حصہ ادبار نجوم کے وقت سے شروع ہوتا ہے۔ رات کے پہلے ابتدائی حصے یعنی غروب شمس کے وقت سے کون انکار کرسکتا ہے غروب کے بعد مغرب کی نماز پہلے سے فرض ہوئی اور دوسرے ابتدائی حصے میں یعنی غروب شفق کے بعد عشاء کی نماز جو پہلے سے فرض چلی آرہی ہے اسی طرح پڑھی جائے گی۔ ادبار النجوم والی نماز تو پہلے سے آنحضرتؐ پر فرض اور امت کے لئے تطوع کے طورپر چلی آرہی ہے اس سے پہلے دوروں میں رات کی نماز عموی فرض ایک ہی تھی۔ اس لئے صرف "ومن اللیل" اس وقت کہہ دینا کافی تھا جو ادبار النجوم والی نماز کو بھی اپنی معنوی وسعت کے دامن میں لے لیتا تھا مگر اس چوتھے دور میں چونکہ عموی فرض نمازیں دو ہوگئیں' اور وہ ادبار النجوم والی بھی باقی رہی' اس لئے اب صرف "ومن اللیل" کا لفظ کافی نہ تھا۔ تو بصیغہ جمع زلفا" من اللیل فرمایا گیا۔

اس آیت کے نزول کے بعد سے فرض نمازیں چار وقت پڑھی جاتی رہیں دن کو فجر اور عصر رات کو مغرب اور عشاء یہاں تک کہ ہجرت کا حکم ہوا پہلے صحابہؓ میں سے جو صحابیؓ تیار ہوئے مدینہ طیبہ روانہ ہوئے صحابہؓ کی ہجرت کا سلسلہ جاری رہا آخر میں آنحضرتؐ خود اپنے رفیق حضرت صدیق اکبرؓ کے ساتھ مکہ معظمہ سے باہر نکلے بالاخر مدینہ طیبہ سے دو میل دور مقام قبا میں پہنچے اور یہاں ٹھہر کر ایک مسجد بنائی اس مسجد میں مدینہ طیبہ کی روانگی سے پہلے ایک شب کو مغرب و عشاء کے درمیان سورہ طہ کی آیت ۱۳۰ نازل ہوئی۔

نماز کا پانچواں دور

حکم نماز کی چھٹی آیت

واصبر علی مایقولون وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل غروبها ومن اناء اللیل فسبح واطراف النہار لعلک ترضی ○ (طہٰ : ۱۳۰)

"اے رسول تم صبر کرو اس پر جو مخالفین بولتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح صلوٰۃ ادا کرو طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب آفتاب سے پہلے اور اس آنے والی رات کے چند ساعات میں اور اس کے دن کے کناروں کے ساتھ پھر تسبیح کیا کرو تاکہ درجہ رضا کو پہنچو۔" (۲۰ : ۱۳۰)

اللہ تعالیٰ نے رسولؐ اور مومنین کے لئے نماز کے دور مقرر فرمائے تھے جب تک جس دور کو مناسب سمجھا قائم رکھا بعثت کے بعد شروع شروع چوبیس گھنٹے میں صرف ایک ہی نماز کا حکم دیا وہ بھی غیر معین وقت میں جس وقت موقعہ ملے پڑھ لو پھر ہلکی سی پابندی کے ساتھ صرف دو وقت کی نماز فرض کی پھر تین وقت پھر چار وقت اور ہر دور کی ایک مدت مصلحت خداوندی کے مطابق اپنے علم میں مقرر فرمادی تھی یہ آیت کریمہ جس رات کو اتری تھی وہ رات چار وقت کی نماز کے دور کی آخری رات تھی اور اس کے بعد والا دن آخری دن تھا اس لئے فرمایا گیا کہ اس رات کے بعد جو دن آئے اس میں صرف قبل طلوع شمس و قبل غروب دو ہی نمازیں دن کی پڑھ لو اس کے بعد جو رات آئے گی اگرچہ سابق ہی راتوں کی طرح اس میں نمازیں بلا فرق پڑھی جائیں گی مگر یہ رات چار نمازوں والے دور کو ختم کرکے آئے گی اس رات کا تعلق پانچ فرض نمازوں کے دور سے ہوگا اس رات کا جوڑ آنے والے اطراف النہار کے دن کی تین نمازوں والے دن سے ہوگا اس مفہوم کو واضح کرنے کے لئے "واطراف النہار" واؤ معیت کے ساتھ لایا گیا اس آیت کریمہ میں دن کی نمازوں کے دو بار ذکر رات کی گھڑیوں کے ذکر سے پہلے بھی اور بعد کو بھی۔ پہلے صرف دو وقتوں کا ذکر اور بعد کو بصیغہ جمع دن کے حصوں کا ذکر بلا وجہ نہیں قرآن مجید میں کوئی لفظ بغیر مقتضائے بلاغت کے

کسی آیت میں نہیں آیا ہے اگر مقصود طرفی النہار ہی کا مفہوم تھا اور مراد وہی قبل طلوع و قبل غروب ہی والے دونوں وقت ہوتے اور بس۔ تو بے ضرورت تکرار لایعنی سے کونسی بلاغت کلام میں آگئی اور طرفی النہار کو اطراف النہار کہنے میں کونسی ادبی خوبی پیدا ہوگئی؟ کس کو قبل طلوع اور قبل غروب والی نمازوں سے انکار تھا یا تکاسل اور تذبذب تھا جس کے لئے تاکید کی ضرورت پڑی۔ بے ضرورت تاکید تو فصاحت و بلاغت والے تو کجا معمولی زبان دان بھی کسی زبان میں نہیں کرتے۔ نماز کے کسی وقت کا ذکر ایک ہی آیت میں مکرر کیوں آیا اس کو زیر غور لانا ہر مفسر کا فرض تھا اور نہیں کہا جاسکتا کہ اگلے مفسرین نے اس کو محسوس ہی نہیں کیا رازیؒ بیضاوی و زمخشری ایسے نہ تھے کہ اس آیت کی اس گرہ کی دشواری کو محسوس نہ کرتے انہوں نے محسوس تو کیا مگر افسوس کہ ان کی جانب سے اس بھاری پتھر کو اٹھانے کی کامیاب کوشش نہیں کی گئی۔

ایک اہم نکتہ

قرآن حکیم نے رات اور دن کی نمازوں کے اوقات بیان کرنے میں یہ انداز بیان رکھا ہے کہ سابق دور کے اعتبار سے اس نئے دور میں جس کے لئے یہ نئی آیت اتری ہے، اگر رات کی نماز میں کوئی اضافہ خاص یا عام فرض عشاء کے بعد ہوا ہے تو ایک ہی جملے میں دن کے ساتھ رات کی نماز کا ذکر نہیں فرمایا گیا بلکہ رات کی نماز یا نمازوں کا ذکر الگ جملے میں ہوا ہے اور اگر کسی نئے دور میں بعد عشاء کی نمازوں میں کسی طرح کا اضافہ سابق دور کے حکم پر نہیں ہوا ہے یا کوئی نئی بات نہیں ہوئی ہے تو ایک ہی جملے میں دن رات دنوں وقت کی نمازوں کا وقت بتا دیا گیا ہے۔

دیکھئے پہلے پہل چوبیس گھنٹے میں ایک ہی نماز فرض ہوئی تھی تو نہ دن کا ذکر تھا نہ رات کا مگر لوگ عموماً" دن ہی کو پڑھتے تھے۔ الا ماشاء اللہ اس کے بعد دو وقت نماز فرض ہوئی ایک حین تقوم (جس وقت تم صبح کو اٹھو) یہ دن کی ایک نماز ہوئی اس کے بعد رات کو خاص طور سے نماز فرض ہو رہی ہے اس لئے رات کی نماز کا ذکر ایک الگ آیت کریمہ میں فرمایا گیا "ومن

اللیل" کہہ کر ایک نماز خاص رسول کے لئے رات ہی کو ادبار النجوم کے وقت فرض ہوئی۔

پھر جب تین وقت کی نماز فرض ہوئی تو چونکہ رات کو عشاء کی نماز کا ضمیمہ ادبار السجود والی وتر کی نماز بھی سب پر فرض ہوئی اس لئے اس موقعہ پر بھی "ومن اللیل" کہہ کر رات کا ذکر الگ آیت میں فرمایا گیا مگر جب چار وقت کی نماز فرض ہوئی تو فرض عشاء کے بعد نہیں بہت پہلے دن کے ختم ہوتے ہی بالکل آغاز شب میں مغرب کی نماز فرض ہوئی جس وقت رات نے محض پہلا قدم سطح کائنات پر رکھا ہے اس لئے اس کے لئے جو آیت اتری ہے تو ایک ہی جملے میں دن اور رات دونوں وقتوں کی نمازوں کا ذکر فرمادیا گیا۔

دوسرا نکتہ یہ بھی ملحوظ رہے کہ جب تک رات کے وقت ایک ہی نماز فرض رہی جو آیت اتری اس میں رات کی نماز کا ذکر صرف "ومن اللیل" کے لفظ سے فرمایا گیا جس کے ضمن میں ادبار النجوم اور ادبار السجود والی نمازیں بھی آگئیں مگر جب رات کو دو نمازیں فرض ہوگئیں تو اب ادبار النجوم والی نماز لگا کر تین نمازیں ہوگئیں اور ادبار السجود والی کو بھی ملا لیجئے تو چار نمازیں رات کی ہوگئیں اس لئے زلفا" "من اللیل" اور "اناء اللیل" بصیغہ جمع فرمایا گیا۔ قرآنی آیات میں تدبر کرتے وقت قرآن مجید کی رفعت شان کو ملحوظ نہ رکھنا بعض موقعہ پر سخت گمراہ کن نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ ادب عربی سے نابلد ہوتے ہوئے تدبر فی القرآن۔ قرآن مجید کے ساتھ بڑی بے ادبی ہے۔

اس آیت کریمہ[۱] میں دوسری آیتوں کی طرح رات کی نماز سے پہلے دن کی

---

[۱] سورہ طہ کی اس آیت کی ابتدا فاصبر کے لفظ یعنی صبر کے حکم سے فرمائی گئی ہے آنحضرتؐ کے مکہ سے ہجرت کرلینے کے بعد مکہ مکرمہ میں آپ کے اور مسلمانوں کے خلاف مشرکین مکہ کیا کچھ نہیں بولتے ہوں گے اور مدینہ میں بھی کفار و مشرکین تھے اور قبا جہاں آپ ٹھہرے ہوئے تھے وہاں اور اس کے اطراف میں بھی کیا نہ تھے؟ پھر یہودیوں کا تو مدینہ طیبہ گڑھ بنا ہوا تھا وہ تو غیر یہودی اہل مدینہ پر بھی اپنا اقتدار قائم کئے ہوئے تھے۔ یہ سب کیا کیا بول رہے تھے آپ کو ضرور خبریں مل رہی ہوں گی اس لئے صبر کی تلقین فرمائی گئی اور پنجگانہ نماز جو فرض ہوگئی ان پانچوں نمازوں کو صحیح طور سے پابندی وقت کے ساتھ ادا کرتے رہنے سے بندگی کا اعلیٰ ترین درجہ جو رضا کا ہے وہ حاصل ہوتا ہے یعنی مالک ہی کی رضا کو اپنی رضا بنا لینا راضی

نمازوں کا ذکر ہے اور رات کی نماز کے بعد پھر دن کی نمازوں کا ذکر پہلے سے زیادہ اوقات میں ہے اور جو دن کسی رات سے پہلے گزرا وہ دن اس رات کے بعد نہیں آسکتا۔ یقیناً "گزشتہ دن آنے والے دن کا مغائر[۱] ہی ہوگا اور دو مغائر دنوں کے دو مغائر حکم بھی ہوسکتے ہیں اور اس آیت میں رات کے پہلے جو دن تھا اس کے لئے وہی حکم ہے جو پہلے دور سے چلا آرہا ہے اور رات کے بعد جس دن کا ذکر ہے اس کے لئے ایک نیا حکم ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ اس رات سے پہلے جو دن تھا وہ اپنے دور کا آخری دن تھا اور اس رات کے بعد جو دن آیا یہ ایک نئے دور کا پہلا دن ہے رات کے پہلے جو دن تھا اس کے لئے کوئی نیا حکم نہ ہوا وہی طرفی النہار والا حکم قبل طلوع و قبل غروب والا ہی فرمایا گیا مگر رات کے بعد والے دن کے لئے ایک نیا لفظ "اطراف النہار" فرمایا گیا جس سے دن کے تین حصے مقصود ہیں دو حصے تو قبل طلوع و قبل غروب والے ابتداء سے متعارف ہیں ایک حصہ ان دونوں کے درمیان ہی کا بچا ہوا تھا اب اس میں بھی ایک نماز فرض ہوگئی۔ اور شروع میں دو وقتوں کا اور آخر میں بصیغہ جمع دو سے زیادہ وقتوں کا ذکر کیوں ہوا؟ اس کی توجیہ وجیہ جو میں نے بیان کی ہے اس کو کوئی شخص ادبی حیثیت سے غلط تو کیا کہے گا ضعیف بھی نہیں کہہ سکتا اور اس کے سوا کوئی دوسری توجیہ کوئی بیان بھی نہیں کرسکتا اور پھر اس توجیہ وجیہ سے قرآن مجید کی رفعت شان بلاغت بھی نمایاں ہورہی ہے مگر افسوس

رمز ہر نکتہ دقیق و ظرف بحث عوام — گر گلو پارہ کنم کس بسخن وا نرسد

والحمد للہ الذی یختص برحمتہ وفضلہ من یشاء

برضائے رب رہنا یہ بات پابندی نماز پنجگانہ ہی سے حاصل ہوسکتی ہے اس کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی اسی سے "لعلک ترضی" فرمایا گیا۔ غرض اس آیت میں صبر و رضا دونوں کی تلقین ہے۔

[۱] یوں تو ہر رات دوسری رات سے اور ہر دن دوسرے دن سے باعتبار تشخص کے مغایرت رکھتا ہے مگر دونوں دنوں کا حکم اگر ایک ہے تو دونوں دن ایک جنس کے ہوئے جنسی مغایرت دونوں میں نہیں ہے اور اگر دونوں کے دو حکم ہیں تو جنسی مغایرت دونوں میں ہوئی میری مراد جنس میں مغایرت سے ہے۔ ہر دور کا دن دوسرے دور کے دن سے مغایرت رکھتا ہے اسی طرح ہر دور کی رات دوسرے دور کی رات سے تغایر رکھتی ہے گو بظاہر حکم میں مغایرت معلوم نہ ہو جیسے آخر شعبان میں رمضان کی رویت ہلال والی رات کہ یہ رات تو کھانے پینے ہر بات میں سابق راتوں کی طرح بظاہر رخصت ہے مگر اس کے اگلے والا دن اس کے بعد والے دن کے مغائر ہے۔

حکم صلوۃ کی ساتویں آیت

جس رات کو سورہ طٰہ کی مذکورہ بالا آیت اتری تھی اسی رات کو تہجد کی یا نماز صبح کے بعد سورۂ بنی اسرائیل کی مسلسل سات آیتیں اتریں آیت ۷۸ سے آیت ۸۴ تک جن میں سے پہلی آیت خاص حکم اقامت صلوۃ کے متعلق ہے بلکہ یوں سمجھئے کہ سورہ طٰہ کی مذکور بالا آیت کی تفسیر ہے یعنی اطراف کے دو طرف تو قبل طلوع و قبل غروب پہلے سے معلوم تھے تیسری طرف یعنی دن کا تیسرا حصہ بھی ضروری سمجھا جارہا تھا کہ قبل طلوع و قبل غروب کے درمیان کا حصہ ہی دن کا تیسرا حصہ ہوسکتا ہے مگر تیسرا حصہ طلوع کے بعد شروع ہوجائے گا' اور آثار غروب یعنی زردی و اضمحلال آفتاب سے پہلے ختم ہوگا تو اس گیارہ بارہ گھنٹے کے وقفے میں کس وقت سے ان کے درمیانی حصے کی نماز شروع کی جائے گی اور کون سا وقت اس کا آخری وقت ہوگا انسان اپنی درایت و فراست سے تو ضرور سمجھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے **وجعلنا النہار معاشا** (ہم نے دن کو انسانوں کے لئے بلکہ ہر حیوان کے لئے معاش کا وقت بنایا ہے) اس لئے دن کے وقت فکر معاش کی فرصت بھی انسان کو ضرور ملنی چاہئے اور عام طور سے انسان طلوع آفتاب سے دوپہر تک فکر معاش میں مصروف رہتا ہے دوپہر کو گھر آکر کھاپی کر دوپہر مناتا ہے اس لئے نماز کے لئے دن کا تیسرا حصہ اگر ہوسکتا ہے تو دوپہر کے بعد ہی اس کا وقت شروع ہوگا یہاں تک کہ قبل الغروب والی نماز کا آغاز وقت آجائے جب آفتاب میں زردی آجاتی ہے۔ مگر بنی اسرائیل کی اس آیت میں اس کو واضح بھی فرمادیا۔ ارشاد ہوا۔

اقم الصلوۃ لدلوک الشمس الی غسق اللیل وقران الفجر ان قران الفجر کان مشھودا○ (بنی اسرائیل آیت ۷۸)

"(اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) نماز (کا نظام) قائم کرو دلوک آفتاب سے غسق لیل تک اور فجر کے قرآن کو قائم رکھو بلاشبہ فجر کا قرآن قابل دید و شنید ہوتا ہے" (۱۷:۷۸)

دلوک کے معنی ہیں کھسکنا۔ آفتاب جب انتہائے عروج خط نصف النہار پر آکر وہاں سے نیچے کی جانب کھسکتا ہے تو اسی کو زوال شمس کہتے ہیں یہ آفتاب کا پہلا دلوک ہے پھر جب تک آفتاب اپنی تابانی پر قائم رہتا ہے اس کی وہی پہلے دلوک والی منزل باقی رہتی ہے جب آفتاب میں زردی آگئی تو یہ اس کا دوسرا دلوک ہوگیا جو قبیل غروب تک باقی رہے گا غروب آفتاب پر اس کی دوسری دلوک کی منزل ختم ہوجائے گی اور غروب اس کا تیسرا دلوک ہوگا جب تک شام کا دھندلکا فضا میں اور شفق آسمان پر موجود۔ہے آفتاب اپنی تیسری دلوکی منزل میں سمجھا جائے گا یہاں تک کہ شفق سفید بھی جو شفق احمر کے بعد افق پر نظر آتی ہے وہ بھی غروب ہوجائے تو غسق اللیل کا وقت آجائے گا شفق سرخ یا سفید' آفتاب ہی کے آثار ہیں اور پتہ بتاتے ہیں کہ "ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے۔" اس لئے غروب شفق آفتاب کا آخری چوتھا دلوک ہے۔ اور حکم ہے کہ دلوک آفتاب کے بعد اقامت صلوۃ کرو اس لئے ہر دلوک کے بعد ایک نماز فرض ہوئی ہے۔ دلوک اول زوال کے بعد ظہر کی نماز جو اب پہلے پہل فرض ہوئی ہے دلوک دوئم زردی و اضمحلال آفتاب کے بعد عصر کی نماز غروب آفتاب کے بعد مغرب کی نماز اور غروب شفق کے بعد عشاء کی نماز ظہر' عصر' مغرب' عشاء کی نمازیں تو صرف "لدلوک الشمس" سے ثابت ہورہی ہیں اور فجر کے لئے قرآن الفجر کی اقامت کا حکم ہوا۔ چونکہ اقم الصلوۃ کے حکم کے ماتحت اس جملے کا عطف ہے اور پھر اس سے پہلے دوسرے ہی دور سے صبح کی نماز کا حکم چلا آرہا ہے تیسرے دور سے قبل طلوع الشمس کے صریح لفظوں میں حکم ہے اس لئے قرآن الفجر سے مراد فجر کی نماز ہی سمجھی جائے گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ فجر کی نماز میں قرات طویل فرمایا کرتے تھے اس لئے اس طول قرات کی پسندیدگی کے اظہار کے لئے صلوۃ الفجر کا نام قرآن الفجر رکھا گیا۔ اور فجر کی نماز کا ذکر قرآن الفجر کے پیارے لفظ سے فرمایا گیا جیسے حضرت یونس علی نبینا علیہ السلام کا ذکر ذوالنون کے پیارے لقب سے فرمایا گیا۔ غرض یہ کہ اس آیت سے بھی پنجگانہ نمازوں کی فرضیت کا صاف پتہ چل رہا ہے۔

ضد اور غیر مفید ضد

زیادہ تر اہل لغت[1] نے دلوک شمس سے زوال شمس اور غروب شمس کو مراد لیا غروب شمس کی طرف اہل لغت کا رجحان زیادہ ہے کیونکہ بعض کا قول ہے کہ دلوک کے معنی ہی غروب کے ہیں' قرب الموارد میں دلوک شمس کے معنی زردی آفتاب و غروب آفتاب لکھ کر بقول ضعیف زوال آفتاب دلوک کے معنی لکھے ہیں۔ مگر مصنف کتاب الصلوۃ دلوک شمس کے معنی صرف زوال ہی کے لیتے ہیں اور آفتاب کا ایک ہی دلوک تسلیم کرتے ہیں اور وہ صرف زوال آفتاب ہے اور اس زوال کے بعد والی نماز کا وقت زوال شمس کے بعد سے غروب شمس کے قبل تک قرار دیتے ہیں حالانکہ طرفی النہار سے مراد قبل طلوع الشمس ' قبل الغروب دو وقت کی دو نمازیں دن کے دونوں حصوں میں اس آیت کے نزول کے قبل سے آرہی ہیں دونوں کے درمیان کا ایک حصہ بچا ہوا تھا اس درمیان میں زوال کے بعد ایک نماز فرض قرار دی گئی۔ دن کی تین نمازیں ہوگئیں قبل طلوع الشمس و قبل غروبہا دونوں وقتوں میں ہر ایک کا منتہا بتایا گیا ہے مگر کسی کا ابتدائی وقت نہیں بتایا گیا اس لئے کہ عیاں راچہ بیان جس وقت سے آثار طلوع فجر نظر آنے لگیں اس وقت سے قبل طلوع والی نماز کے وقت کی ابتدا ہے اسی طرح جس وقت سے آثار غروب نمایاں ہونے لگیں قبل غروب والی نماز کی ابتدا ہے پو پھٹنے سے جس طرح آثار طلوع کی نمود شروع ہوتی ہے اسی طرح زردی و اضمحلال شمس سے غروب کے آثار کی نمود شروع ہوجاتی ہے۔ زوال آفتاب کے بعد والی نماز زردی آفتاب کے قبل پڑھ لینی چاہئے الی غسق اللیل نے

---

[1] لسان العرب میں دلوک کے معانی کی لمبی تفصیل لکھی ہے دلکت الشمس قد لک دلوکا غربت فقیل اصفرت فعالت للغروب ۔ فقد دلکت ذالت من کبد السماء یعنی تین معنی ہوئے یعنی غروب آفتاب' زردی آفتاب' اور زوال آفتاب اس کے بعد آفتاب کا ایسی جگہ پر آجانا کہ مغرب کی طرف جانے والے کی آنکھوں کے سامنے پڑے اور دیکھنے والے کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہتھیلی یا کوئی اور چیز اوٹ کے لئے رکھ لینا پڑے آنکھوں کے سامنے آفتاب کے پڑنے کی وجہ سے زردی آفتاب کا وقت غروب سے تقریباً" ایک گھنٹہ قبل سے ہے۔

بتایا کہ نماز کے اوقات زوال شمس کے بعد سے شروع ہوتے ہیں زردی آفتاب کے قبل تک ظہر کا وقت رہتا ہے۔ زردی آفتاب میں آئی اور عصر کا وقت شروع ہوگیا جو قبل الغروب تک رہتا ہے غروب آفتاب کے بعد مغرب کی نماز کا وقت آگیا جو غروب شفق پر ختم ہوتا ہے' غروب شفق کے بعد ہی عشاء کا وقت آگیا جو ادبار النجوم سے پہلے ختم ہوجاتا ہے۔ غسق اللیل کے معنی مفردات میں شدۃ ظلمۃ لکھا ہے جس کی ابتدا غروب سے ہوتی ہے اور انتہا ادبار النجوم پر ادبار النجوم رات کا وہ وقت ہوتا ہے جب مغرب کے وقت نکلنے والے تارے نصف اللیل تک پہنچ کر مائل بغروب ہونے لگتے ہیں اور نئے ستارے جو صبح سے کچھ پہلے نکلتے ہیں وہ طلوع ہوجاتے ہیں تو سر پر بھی کچھ بڑے بڑے ستارے آجاتے ہیں اور افق پر بھی اس لئے فضا میں تاروں کی روشنی شدۃ الظلمۃ کا رنگ پھیکا کردیتی ہے اور غسق کا وقت ختم ہوجاتا ہے اور جب غسق کا وقت ختم ہوا تو نماز عشاء کا وقت بھی ختم ہوا اب ادبار النجوم والی نماز تہجد کا وقت آگیا۔

مصنف الصلوۃ نے غسق کے معنی ابتدائی شب کی تاریکی لکھا ہے کہ مغرب کی نماز کو عشاء کی نماز قرار دینے کا موقع ملے غروب شفق سے پہلے عشاء کی نماز پڑھ لی جائے جو سراسر خلاف قرآن مجید ہے۔ اس لئے کہ قرآن مجید میں گھر کے نوکر چاکر کو' جوان یا مراھق لڑکوں کو خواب گاہ میں بے اجازت آنے سے منع کرنے کا حکم تین وقت ہے نماز فجر سے پہلے اور نماز عشاء کے بعد اور جس وقت دوپہر کو خواب گاہ میں قیلولہ کرتے ہیں' مصنف کے نزدیک غروب آفتاب سے غروب شفق ہی کے وقت تک عشاء کی نماز کا وقت ہے تو جو شخص غروب آفتاب کے بعد ہی عشا کی نماز پڑھ لے کیا وہ نماز پڑھ کر خواب گاہ میں گھس جائے اور لوگوں کو بے اجازت سامنے آنے سے منع کردے؟ قرآن نے اس آیت حکم پردہ سے عشا کی نماز کا وقت بتادیا کہ عشا کی نماز ایسے وقت پڑھی جائے کہ نماز کے بعد باہر کا کوئی کام باقی نہ رہے اور آدمی خواب گاہ ہی میں داخل ہوجائے اس لئے غسق کے معنی راغب نے جو مفردات القرآن میں لکھے ہیں "شدۃ الظلمۃ" وہی صحیح معنی ہیں اور ابتدائے شب کی تاریکی غسق کے معنی غلط ہے۔ غسق اللیل کے معنی رات کا بھیگ جانا' گھپ اندھیرا ہوتا ہی ہے تاکہ عشاء کی نماز پڑھ کر

آدمی خواب گاہ میں داخل ہوجائے۔

اس رسالہ کے اختتام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سورہ بنی اسرائیل کی ان سات آیتوں (از ۷۸ تا ۸۴) کے چند اہم تفسیری نکات اجاگر کردیئے جائیں جن آیتوں کا تذکرہ "حکم صلوۃ کی ساتویں آیت) کے تحت کرتے ہوئے لکھا گیا تھا کہ وہ مسجد قبا میں نازل ہوئیں۔

اقم الصلوة لدلوک الشمس الی غسق اللیل و قران الفجر ان قران الفجر کان مشهودا ○ ومن اللیل فتهجد به نافلة لک عسی ان یبعثک ربک مقاما محمودا ○ وقل رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا ○ وقل جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل کان زهوقا ○ وننزل من القران ما هو شفاء و رحمة للمومنین ولا یزید الظلمین الا خسارا ○ واذا انعمنا علی الانسان اعرض ونا بجانبه واذا مسه الشر کان یوسا ○ قل کل یعمل علی شاکلته فربکم اعلم بمن هو اهدی سبیلا ○ ع

(سورہ بنی اسرائیل آیت ۷۸ تا ۸۴)

ترجمہ :- "نماز کا نظام قائم کرو آفتاب کے دلوک کے بعد سے غسق اللیل تک اور فجر کی نماز میں قرآن کی طویل قرات' قائم کرو۔ بلا شبہ فجر کا قرآن قابل شنید ہوتا ہے۔ اور رات کو (سوکر اٹھنے کے بعد) تہجد کی نماز پڑھا کرو یہ تمہارے لئے ایک فاضل فریضہ ہے وہ وقت قریب ہے کہ تمہارا رب تم کو مقام محمود پر فائز کردے اور دعا یوں کرو کہ اے میرے رب تو مجھ کو جہاں پہنچا سچی کامیابی کے ساتھ پہنچا اور جہاں سے مجھ کو نکال سچی کامیابی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے مجھ کو فتح و نصرت والا اقتدار عطا فرما اور کہو حق پہنچ گیا اور باطل بھاگ نکلا۔ باطل تو بھگوڑا ہی ہوتا ہے اور ہم اس قرآن کے سلسلہ تنزیل میں ایسی آیتیں اتارتے رہیں گے جو مومنین کو شفا و رحمت ہوگی مگر ظالموں کے لئے خسارے اور گھاٹے میں زیادتی ہوگی اور ظالم انسان کا تو یہ عالم ہے کہ جب اس کو ہم نے نعمتوں سے نوازا تو ہم سے روگردانی کرنے لگا اور اپنے زعم پر اترانے لگا اور جب کسی مصیبت سے اس کو سابقہ پڑا تو (ہماری رحمت سے) ناامید ہوبیٹھا تم ان لوگوں سے کہہ دو کہ ہر شخص اپنی افتاد طبع کے مطابق عمل کرتا ہے مگر تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ کون پوری طرح سیدھی راہ پر ہے (اور رہے گا)" (۱۷: ۷۸ تا ۸۴)

(۱) ان آیتوں میں سے سب سے پہلی آیت میں تو ایک اور نماز کا اضافہ کرکے پوری پنجگانہ نماز جو اگلی امتوں پر بھی فرض تھی اس کی تکمیل فرمادی۔ جس کی مکمل بحث گذشتہ اوراق میں موجود ہے۔

(۲) جو غیر قرآنی وحی کسی دینی بات کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی وقت آئی ہے اس کا ذکر کسی نہ کسی موقع پر قرآن مجید میں ضرور ہی فرمادیا گیا ہے تاکہ وہ وحی بالکل غیر قرآنی نہ رہے جس نماز کو نماز تہجد کہتے ہیں یہی نماز ادبار النجوم والی نماز ہے۔ جو اس وقت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض چلی آرہی ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور سارے مومنین پر صرف دو وقت کی نماز فرض ہوئی تھی مگر غیر قرآنی وحی سے آپ کو مطلع کردیا گیا تھا کہ یہ ادبار النجوم والی نماز صرف آپ ہی پر فرض ہے۔ عام مومنین پر نہیں یہاں اس میں صرف اتنی بات بڑھادی گئی کہ ذرا سوکر کچھ دیر آرام کرکے اٹھنے کے بعد یہ نماز پڑھا کیجئے۔ اب یہ اس لفظ تہجد کے سبب سے اسی ادبار النجوم والی نماز کا نام تہجد پڑگیا ورنہ یہ کوئی نئی نماز آپ پر اس وقت فرض نہیں ہوئی اب اس نماز کی آپ کے لئے مخصوص فرضیت غیر قرآنی نہ رہی قرآنی ہوگئی نافلۃ لک فرمادینے کی وجہ سے۔

(۳) مقام محمود ایک بہت بڑا درجہ ہے جو آپ کو ملا جس کو ہر شخص قیامت کے دن دیکھ لے گا انشاء اللہ۔

(۴) رب ادخلنی والی دعا میں پہلے داخل کئے جانے کے بارے میں دعا ہے اس کے بعد خارج کئے جانے کے بارے میں' بظاہر الٹی بات معلوم ہوتی ہے' آپ تو پہلے مکہ مکرمہ سے نکلے تھے اس کے بعد مدینہ منورہ میں داخل ہوئے اس لئے پہلے نکلنے کے بارے میں دعا کرنی چاہئے تھی ٹھیک ہے اگر اصل مقصود مکہ سے نکل جانا ہوتا۔ تو پہلے اخرجنی کی دعا کا حکم ہوتا۔ مگر مکہ مکرمہ سے اخراج تو ہوچکا آپ مقام قبا میں پہنچ گئے جہاں سے مدینہ طیبہ صرف دو میل پر ہے اب اخراج کے متعلق دعا کیسی؟ البتہ اب مدینہ طیبہ میں داخلہ باقی ہے اور اصل مقصود صرف مکہ مکرمہ سے نکل جانا تو تھا نہیں اصل مقصود تو کامیابی کے ساتھ مدینہ میں داخل ہوجانا ہے اگر مدینہ طیبہ میں آپ کا داخلہ مبارک اور سچی کامیابی والا ہے تو مکہ مکرمہ سے آپ کا

نکلنا بھی مبارک اور سچی کامیابی والا ہے۔ اخراج کا مبارک و کامیاب ہونا موقوف ہے مدینے میں داخلے کی کامیابی اور مبارک ہونے پر تو اصل کامیابی کی دعا کو مقدم قرار دیا یعنی ہمارے مدینے میں داخلے کو سچی کامیابی عطا فرما تاکہ مکہ مکرمہ سے ہمارا اخراج ہمارے مدینہ منورہ میں داخلہ کی سچی کامیابی کا باعث اور مبارک ہو۔

(۵) مدینہ طیبہ اور اس کے اطراف میں بھی وہی جاہلیت تھی جو مکہ مکرمہ کے مشرکین میں تھی اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ منورہ میں پہنچنا حق و صداقت تھا تو باطل کا وہاں سے بھاگ نکلنا ضروری تھا اس لئے اس کے اعلان کا حکم بھی فرمایا گیا کہ تم خود اعلان کرو کہ حق آگیا اور باطل بھاگا اور باطل کی فطرت ہی ایسی ہے کہ جب حق کا اور اس کا مقابلہ ہوگا تو حق کے سامنے اس کا قدم نہیں ٹھہر سکتا۔

(۶) قرآن مجید کی ۱۱۴ سورتوں میں سے ۸۶ سورتیں مکہ مکرمہ میں اتر چکی تھیں یہ گمان ہوسکتا ہے کہ کتاب اللہ مکمل اتر گئی ہے اب کوئی اور حصہ اس کے اترنے کے لئے باقی نہیں ہے یہ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے اشارۃ فرمادیا گیا ہے کہ بہت کچھ قرآن مجید کا اترنا باقی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ہم ایسی ایسی سورتیں اور آیتیں اور اتارنے والے ہیں جو مومنین کی قلبی و روحانی امراض کے لئے شفا و رحمت ثابت ہوں گی مگر جو لوگ اپنے نفس پر آپ ظلم کرنے والے ہیں ان کو اس کتاب سے نفع نہیں گھاٹا ہی ہوگا۔ ظلم کی وجہ سے وہ گھاٹے ہی میں رہیں گے۔ اس کتاب کی آیتوں کو قبول نہ کرنے کی وجہ سے ان کا خسارا اور بڑھتا جائے گا۔

(۷) اس کے بعد عام انسانی فطرت بھی بتادی گئی کہ دولت و ثروت ملے تو انسان نافرمانی و سرکشی کی طرف مائل ہوتا ہے اور اگر تکلیف و مصیبت سے واسطہ پڑے تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مایوس ہوجاتا ہے ہر شخص کا کام اس کی افتاد طبع ہی کے مطابق ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ خوب اچھی طرح جانتا ہے کہ کون راہ ہدایت پر ہے کون بعد میں راہ ہدایت اختیار کرے گا۔ آیتیں مکہ مکرمہ سے نکلتے وقت مدینہ پہنچنے سے پہلے نازل ہوگئیں تھیں تاکہ ہر مومن کو معلوم رہے کہ ابھی نزول قرآن کا سلسلہ باقی ہے۔

(۸) سورہ بنی اسرائیل مکی ہے صرف یہ سات آیتیں مدنی ہیں مگر چونکہ مدینہ پہنچنے سے پہلے اثنائے راہ میں اتریں اس لئے بعضوں نے پوری سورت کو مکی لکھا ہے مگر اکثروں نے ان سات آیتوں کو مستثنیٰ کیا ہے۔ اور ان کو مدنی قرار دیا ہے اس لئے کہ مدینہ کے جوار (قبا) میں اتری تھیں غرض مدینہ طیبہ پہنچتے ہی پانچ وقت نمازیں پڑھی جانے لگیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ پہنچنے سے پہلے جو مہاجرین مدینہ طیبہ ہجرت کرکے آگئے تھے اور انصار بھی آپؐ کے تشریف لانے تک چار نمازیں پڑھتے رہے پھر آپؐ نے ان کو پانچ نمازیں پڑھانی شروع کردیں۔

نگاہ باز گشت

اب ہم آخیر میں رسالہ ہذا میں پھیلے ہوئے مباحث کا ایک خلاصہ درج کئے دیتے ہیں تاکہ ناظرین کے سامنے نماز پنجگانہ کی تدریجی فرضیت کا پورا نقشہ آجائے۔

نماز کا پہلا دور ۲۴ گھنٹے میں صرف ایک وقت کی نماز بغیر تعیین وقت کے جس وقت موقع ملے پڑھ لے

اتل ما اوحی الیک من الکتب واقم الصلوۃ ط ان الصلوۃ تنهی عن الفحشاء والمنکر ط ولذکر اللہ اکبر ط واللہ یعلم ما تصنعون ○

(سورۃ العنکبوت آیت ۴۵)

"اس کتاب سے جو وحی تمہاری طرف کی گئی ہے اس کی تلاوت کیا کرنا اور اس نماز کی پابندی قائم رکھنا جس کی تمہیں تعلیم دی گئی ہے بے شک نماز بے حیائی کی باتوں اور ناپسندیدہ کاموں سے (انسان کو) روک دیتی ہے۔ اور اللہ کی یاد بڑا سہارا ہے۔ اور تم لوگ جو کچھ بھی کرو گے اللہ تعالی اس کو جانتا ہے۔" (۲۹ : ۴۵)

یہ آیت کریمہ سب سے پہلی آیت ہے حکم نماز کی جو کوہ حرا ہی پر اتری تھی ہر نبی کو منصب نبوت جس وقت عطا ہوا اسی وقت ان پر نماز فرض ہوئی۔ سورہ طہ آیت ۱۴ پڑھئے حضرت موسی علی نبینا وعلیہ السلام کو کوہ طور پر نبوت و رسالت ملی تو اسی وقت ان کو حکم ہوا تھا کہ **اقم الصلوۃ لذکری** "مجھ کو یاد رکھنے کے لئے نماز کی پابندی قائم رکھو" (۲۰ : ۱۴) اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوہ حرا پر خلعت نبوت عطا کرنے کے بعد اس آیت کریمہ کے نزول سے پہلے جو سورہ فاتحہ کے نزول کے وقت عبادت کے صحیح مفہوم کی وحی غیر متلو کے ذریعہ سمجھایا گیا تھا اور نماز کے ارکان و اذکار و طریقہ ادا کی

تعلیم فرمائی گئی تھی۔ یہاں بذریعہ الف لام عہد اسی صلوۃ کی پابندی کا حکم ہوا۔ مگر کوئی وقت اس کے لئے معین کرکے نہیں بتایا گیا اس لئے ہر چوبیس (۲۴) گھنٹے میں صرف ایک بار کسی وقت فرض رہی۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بطور تطوع یعنی نفل اور وہ بھی جب ولولہ عبودیت پیدا ہوا پڑھ لیا کرتے تھے جب اہل و عیال کو پابندی نماز کا حکم ہوا۔ اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالی عنہ اور ان کے ہاتھ پر اور بھی آٹھ دس سعید روح والے ایمان لے آئے یہ سب اسی آیت کے حکم کے مطابق صرف ایک وقت دو رکعت نماز فرض ضرور پڑھ لیا کرتے تھے جس کو موقع مل جاتا تھا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مقتدی بن کر پڑھ لیتا تھا ورنہ تنہا ہی سہی جہاں موقع ملا۔ دوسرے مومنین بھی فرض کے علاوہ تطوع یعنی نفل بھی پڑھ لیتے تھے۔

دوسرا دور جس میں وقت کے تعین کے ساتھ دو وقت کی نماز ہر مومن پر فرض ہوئی۔

واصبر لحکم ربک فانک باعیننا وسبح بحمد ربک حین تقوم ○ ومن اللیل فسبحہ وادبار النجوم ○ (سورۃ الطور آیات ۴۸ - ۴۹)

"تم اپنے رب کے حکم (کی تعمیل) پر ثابت قدم رہو (مخالفتوں سے ڈرو نہیں) کیونکہ تم ہماری نگہداشت میں ہو اور (نماز کے ذریعے) اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح ادا کرو جس وقت تم (صبح کو) سو کر اٹھو اور رات کے کسی حصے میں پھر (اپنے) اس (رب) کی تسبیح (نماز کے ذریعے) ادا کرو۔ اور جس وقت تارے پچھلے پاؤں پھرنے لگیں (یعنی وسط آسمان پر آکر مغرب کی طرف جھکنے لگیں) (۵۲ : ۴۸ - ۴۹) ایک وقت کی نماز بغیر پابندی وقت کے پہلے پہل فرض ہوئی تھی تو مومنین کو تو بہت زیادہ اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مشرکین مکہ حرم کعبہ میں نماز پڑھتے دیکھ کر پریشان کرتے رہتے تھے۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین حرم کعبہ میں

نماز پڑھتے تھے مگر بیت المقدس کی طرف رخ کرکے۔ بیت المقدس یہودیوں کا قبلہ تھا، مشرکین مکہ بنی اسماعیل تھے یہودی بنی اسرائیل اہل مکہ بنی اسماعیل کو ذلیل و حقیر سمجھتے تھے کعبہ مکرمہ حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علی نبینا و علیہما السلام کا تعمیر کردہ تھا اگرچہ اس وقت مشرکین مکہ نے اس کو بت خانہ بنا رکھا تھا اہل مکہ بنی اسماعیل کو ناگوار تھا کہ کعبہ مکرمہ کو چھوڑ کر بیت المقدس یہودیوں کے قبہ کو اپنا قبلہ کیوں بنا رکھا ہے؟ کعبہ مکرمہ کی طرف رخ کرکے نمازیں پڑھتے تو بظاہر ان بتوں کی طرف سجدہ ہوتا جو حریم کعبہ مکرمہ میں رکھے ہوئے تھے۔ تو ایک وقت کی نماز تو لوگ مشکل سے چھپ چھپ کر پڑھتے تھے اب دو وقت کی نمازیں فرض کی جا رہی ہیں۔ ایک دن کو صبح کو رات بسر کرکے جس وقت اٹھو نماز پڑھ لو۔ دوسری رات کو کسی وقت غروب آفتاب سے لے کر ادبار النجوم سے قبل تک کے درمیان یعنی آدھی رات سے پہلے۔ اس لئے پہلے تعمیل حکم پر ثابت قدم رہنے جمے رہنے کی تاکید فرمائی گئی۔ مخالفوں کی مخالفتوں کے متعلق اطمینان دلایا گیا کہ گھبراؤ نہیں تم ہماری نگہداشت میں ہو۔ تمہارا کوئی ایک بال بھی بیکا نہیں کرسکے گا۔

یہ دو وقت کی نمازیں تو عام فریضے کی حیثیت سے رہیں۔ تیسری نماز ادبار النجوم والی جو نصف شب کے بعد سے طلوع فجر کے قبل تک کے درمیان پڑھی جائے گی اس کے متعلق وحی لانے والے فرشتے جبریلؑ نے بتا دیا کہ یہ نماز صرف آپؐ پر فرض ہے مومنین بھی تطوع کی حیثیت سے سے پڑھ سکتے ہیں **ومن تطوع خیرا فھو خیر لہ** "جو شخص کار خیر اپنی خوش دلی سے کرے اس کے لئے بہتر ہی ہے"۔

تیسرا دور تین وقت کی نماز بہ تعیین اوقات

فاصبر علی مایقولون وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل الغروب ومن الیل نسبحہ وادبار السجود○ (سورہ ق آیت ۳۹ ـ ۴۰)

تو (مخالفین) جو کچھ بولتے ہیں اس پر صبر کرو۔ اور (نماز کے ذریعے) اپنے

رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب سے پہلے۔ اور رات کے کسی حصے میں (ادبار النجوم آدھی رات سے پہلے) اور سب نمازوں کے بعد (۵۰: ۳۹ ـ ۴۰)

جب تک ایک وقت کی نماز فرض تھی۔ مشرکین جس کو نماز پڑھتے دیکھتے تھے اس کو نماز پڑھنے سے روکتے تھے منع کرتے تھے ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیتے تھے اسی قسم کی شرارتیں کرتے تھے جب دو وقت کی نماز فرض ہوئی اور پہلے سے زیادہ وہ مومنین کو نماز پڑھتے دیکھنے لگے تو نمازیوں کا مضحکہ اڑانے لگے اور بدزبانی و بدگوئی سے پیش آنے لگے۔ اس لئے اس آیت میں پہلے مخالفوں کی بدزبانی و بدگوئی اور مضحکہ پر صبر کرنے کے لئے فرمایا گیا اور اب تین وقت کی نماز فرض ہوئی۔ دن کو دو وقت کی نماز فرض ہوئی پہلی نماز تو وہی رہی جو دوسرے دور میں تھی جس کا وقت حین تقوم بتایا گیا تھا یعنی جس وقت سوکر اٹھو۔ مگر دوسرے دور میں آزادی تھی، دن چڑھے بھی اٹھے تو اسی وقت نماز پڑھ لی۔ تیسرے دور میں اس میں قبل طلوع الشمس کی قید لگا دی گئی۔ یعنی سحر خیزی کا حکم بھی ہوگیا۔ اب ضروری ہوگیا کہ ہر مومن رات بسر کرکے اتنا سویرے فجر کے وقت اٹھے کہ حاجت ضروریہ سے فارغ ہوکر طلوع آفتاب سے پہلے دن کی پہلی نماز پڑھ لے۔ اسی لئے اس نماز کا نام ہی صلوۃ الفجر رکھ دیا گیا۔ اور جس دن کے ابتدائی حصے میں ایک نماز فرض کی گئی اسی طرح دن کے آخری حصے میں دوسری نماز فرض کی گئی جس کا صرف آخری وقت بتایا گیا کہ "اول باخر نسبتے دارد" اول وقت کی نماز سے آخر وقت کی نماز کی ابتداء سوچنے سے ہر ذہین آدمی خود سمجھ سکتا ہے کہ انسان ہی نہیں حیوان بھی اسی وقت سوکر اٹھتے ہیں جب طلوع آفتاب کے آثار نمایاں ہوتے ہیں طلوع فجر نام ہی ہے آثار طلوع آفتاب کی نمود کا۔ جو شخص رات بھر یا آدھی رات سے جاگ رہا ہے اس کے لئے اس رات کو حین تقوم (جس وقت تم سوکر اٹھو) کا وقت کہاں ہے؟ وہ تو رات بھر سویا ہی نہیں یا آدھی رات سے جاگ رہا ہے۔ دراصل حین تقوم سے مراد یہ ہے کہ جس وقت عام طور سے سونے والے صبح اٹھا کرتے ہیں یہ سمجھ کر کہ اب دن

ہوگیا۔ یہ مطلب نہیں کہ نو دس بجے رات کو کوئی سویا اور بارہ بجے اٹھ گیا تو اس کے لئے حین تقوم والی نماز فرض ہوگئی رات بسر کرکے یہ سمجھ کر کہ اب رات ختم ہوگئی دن ہوگیا چاہے وہ دن کی بالکل ابتدا ہو پوپھٹنے کا وقت یا اسفار کا وقت یعنی پرچھا ہوجائے۔ مگر انفرادی طور سے دور اول میں آزادی تھی کہ اگر کوئی طلوع آفتاب کے بعد تک ابھی سویا ہی رہا اور دن چڑھے اٹھا تو اس کے لئے وہی وقت ادائے فریضہ کا تھا دوسرے دور میں قبل طلوع الشمس کی قید لگا کر سحرخیزی پر ہرمومن کو مجبور کردیا گیا کہ حین تقوم والی نماز کو طلوع آفتاب سے پہلے پڑھ لینا چاہئے۔ آج بھی اگر کسی مومن کی آنکھیں ایسے وقت کھلیں کہ آفتاب طلوع ہوچکا ہے تو اس کے لئے وہی حین تقوم والے حکم کے مطابق اسی وقت وہ دن کی پہلی نماز پڑھے گا۔ اسی لئے حدیث نبوی میں بھی اسی کے مطابق تعلیم ہے۔

غرض آثار طلوع آفتاب کی نمود سے جس طرح دن کی نماز کی ابتدائے وقت سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح آثار غروب آفتاب کی نمود سے دن کی دوسری نماز کے وقت کے ابتدا کیوں نہیں سمجھی جائے گی؟ غروب آفتاب کے آثار شروع ہوتے ہیں زردی آفتاب سے جب آفتاب میں نمایاں طور سے زردی آجائے تو سمجھ لینا چاہئے کہ دن کی آخری نماز جس کو عصر کی نماز کہتے ہیں اس کا وقت آگیا۔ جس کو غروب آفتاب سے پہلے پڑھ لینا چاہئے۔ رات کی نماز اس تیسرے دور میں وہی رہی جو دوسرے دور میں تھی۔ یعنی غروب آفتاب کے بعد سے ادبار النجوم کے قبل تک کے اندر ادبار النجوم کے بعد طلوع فجر کے قبل تک ایک خاص نماز کا وقت ہے۔جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تو فرض مگر عام مومنین کو تطوعاً" پڑھ لینا باعث ثواب مزید ہے۔ اور ایک فریضے کے وقت کو دوسرے فریضے کے وقت میں داخل نہیں ہونا چاہئے۔ ادبار النجوم والی نماز عام مومنین پر نہ سہی خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تو فرض تھی۔ اسی لئے جو مومن تہجد کا پابند ہے اس کو عشا کی نماز آدھی رات سے پہلے پڑھ لینا لازم ہے جو تہجد کا پابند نہیں ہے اس کے لئے نصف شب کے بعد نماز عشا مکروہ ہے۔

اس آیت میں رات کی نماز کا ایک ضمیمہ بھی بتایا گیا ہے۔ ادبار السجود یعنی سب نمازوں کے بعد آخر میں ایک اور نماز پڑھ کر ایک شبانہ یوم کی نمازوں کے سلسلے کو اسی پر ختم کرو۔ مگر اس آخری نماز کے متعلق بذریعہ وحی غیر متلو حضرت جبرئیلؑ نے حضور کو مطلع کیا کہ ہر نماز تو دو دو ہی رکعت پڑھی جاتی آرہی ہے مگر یہ آخری نماز تین رکعت پڑھی جائے گی اسی لئے اس نماز کا نام وتر رکھا گیا اور یہ نماز سب کے لئے فرض ہے۔ وتر کے معنی ہیں طاق یعنی اعداد میں جو عدد برابر دو جگہ تقسیم نہ ہوسکے جیسے ایک تین' پانچ' سات اور نو یہ نماز تین رکعت پڑھی جاتی ہے۔ اس لئے اس کی رکعتیں طاق ہیں تو اس کا نام وتر رکھا گیا۔ مگر یہ کوئی مستقل فریضہ نہیں ہے اسی لئے نہ اس کے لئے اذان ہوتی ہے نہ مسجد کی حاضری نہ جماعت اور نہ اس کا کوئی وقت معین ہے۔ بجز اس کے کہ "ومن الیل" کے بعد اس کا ذکر ہے۔ اس لئے رات ہی کو پڑھی جائے گی۔ اور رات کی سب نمازوں کے بعد پڑھی جائے گی۔ فرض ' نفل ' تہجد جو کچھ بھی پڑھنا ہے سب کے بعد اس تین رکعت کو پڑھنا لازم ہے۔ یہ وتر کی نماز دراصل ضمیمہ ہے رات کی نمازوں کا جو شخص رات کے وقت صرف فرض پڑھے۔ سفر یا مرض یا کسی سخت مصروفیت کی وجہ سے وہ فرض کے بعد فوراً" پڑھ سکتا ہے۔ جس کو فرض کے علاوہ کچھ پڑھنا ہے وہ سب نمازیں پڑھنے کے بعد وتر کی نماز پڑھ لے۔

چوتھا دور چار وقت کی نمازیں بہ تعیین اوقات

اقم الصلوة طرفی النہار وزلفا من اللیل ط ان الحسنت یذھبن السیئات ط ذلک ذکری للذاکرین ○ (سورۃ ھود آیت ۱۱۴)

"نماز کی پابندی قائم رکھو دن کے دونوں کناروں میں اور رات کے کچھ حصوں میں بلاشبہ نیکیاں برائیوں کو دور کردیتی ہیں یہ ایک بڑی نصیحت ہے (اللہ تعالی کو) یاد رکھنے والوں کے لئے۔" (۱۱ : ۱۱۴)

اس دور میں دن کے وقت تو وہی دو نمازیں رہیں جو تیسرے دور میں فرض

ہوئی تھیں البتہ اس آیت نے دن کی ان دونوں نمازوں کے اوقات کا اندازہ بتادیا **طرفی النھار** فرماکر "طرف" کے معنی آنکھ یا نظر کرنا .... تو جہالت ہے آنکھ یا نظر کے معنی میں طرف بروزن حرف یا سمت یعنی بسکون رائے مہملہ اور یہاں بفتح رائے مہملہ ہے۔ اور سمت کے معنی میں اردو فارسی میں مستعمل ہے عربی میں نہیں کسی وسیع چیز کے آخری حصے کو کہتے ہیں جس کا ترجمہ کنارے کیا جاتا ہے یہ کہنا کہ دن کا آخری کنارہ تو اس کا ایک سیکنڈ ہے اول درجے کی ہٹ دھرمی ہے۔ "آخری" کا لفظ اپنی طرف سے کیوں بڑھاتے ہیں "دریا کے کنارے کشتی آگئی" اس سے دریا کا آخری حصہ جو ساحل سے قریب ہو وہی مراد ہوتا ہے طرفی النھار سے دن کا ابتدائی حصہ اور آخری حصہ ہی مراد لیا جاسکتا ہے اور نزول آیت کے وقت سے اس وقت تک جس عربی دان نے بھی اس آیت میں طرفی النھار کا لفظ دیکھا اس سے دن کے دونوں حصے اول روز اور آخر روز ہی سمجھا۔

طرف النھار کا لفظ یہ بھی بتارہا ہے کہ دن کے دونوں کناروں کو جو دو نمازوں کے اوقات بتائے ہیں تو دونوں نمازوں کے وقت کو تقریباً" برابر ہی ہونا چاہئے۔ اگر ابتدائی حصہ دو گھنٹے کا ہے تو آخری حصے کو دو ہی گھنٹے کا ہونا چاہئے دس پانچ منٹ کا فرق ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ مگر ایسا نہیں ہوسکتا کہ ایک کنارہ تو دو گھنٹے کا ہو اور دوسرا کنارہ پانچ گھنٹے کا دو طرف دو کناروں کے معنی ہی یہ ہیں کہ دونوں طرفوں دونوں کناروں کے درمیان کچھ حصہ درمیان کا بیچ کا بھی ضرور ہونا چاہئے دریا کے دو کنارے ہوتے ہیں تو بیچ دریا بھی دریا کا ایک حصہ ہوتا ہے جو اول و آخر حصوں سے بہت بڑا ہوتا ہے اسی طرح طرفی النھار دن کے دونوں حصے ابتدائی حصہ اور آخری حصہ ان دونوں کے درمیان ایک بیچ کا حصہ بہت زیادہ بڑا ہونا چاہئے یعنی دن کے ساعات کو تین حصوں پر تقسیم کرنا ہوگا۔ ابتدائی ساعات اور آخری ساعات اور درمیانی ساعات ابتدائی و آخری ساعات کا برابر ہونا ضروری ہے درمیانی ساعات کے وقفے کو ان دونوں ساعات سے کئی گنا زیادہ بڑا ہونا ضروری ہے۔ قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ نماز ہی کے اوقات بتاتے

ہوئے اطراف النھار کا لفظ بھی فرمایا گیا ہے جس کی بحث پانچویں دور میں آئے گی۔ لیکن دن کے ان تینوں حصوں کے اوقات یعنی ساعات کی تعین کس طرح کی جائے دریا کا پاٹ مثلاً" بارہ سوفٹ کا ہو تو ایک سوفٹ کی مسافت اس کے دونوں کناروں کے لئے اور ایک ہزار فٹ درمیانی حصے کے لئے تجویز کریں گے۔ دن کے بارہ گھنٹوں میں سے سوا گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ہی دونوں کناروں کے لئے دیں گے باقی گھنٹے درمیانی حصہ ہوگا۔ فیصلے کے لئے اول روز کے پہلے حصے کے آخری وقت کی تعین کافی ہے اس لئے کہ دن کی ابتدا طلوع فجر یعنی پوپھٹنے سے ہوتی ہے اور اول روز کی نماز کا آخر وقت قبل طلوع الشمس بتایا گیا ہے۔ تو طلوع فجر و طلوع الشمس کے درمیان کتنا وقفہ ہوتا ہے اس کو ہر شخص جان سکتا ہے۔ مثلاً" یکم جنوری کو کراچی میں طلوع فجر پانچ بج کر پچپن منٹ پر ہوتا ہے۔ اور طلوع آفتاب سات بج کے سولہ منٹ پر دونوں طلوع فجر و طلوع آفتاب کے درمیان ایک گھنٹہ ۲۱ منٹ کا فاصلہ زمانی ہے۔ آپ اسی قدر آخر روز یعنی دن کے آخری حصہ کے لئے بھی وقت رکھ لیجئے قدرے کی بیشی میں کوئی حرج نہیں یعنی اب آخری حصہ کے لئے ڈیڑھ گھنٹہ وقت اگر رکھیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کے درمیان یعنی طلوع آفتاب کے بعد سے غروب آفتاب سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل تک کا پورا وقفہ درمیانی حصے کا رہا یہ درمیانی حصہ دو حصوں پر تقسیم ہوگا زوال سے قبل اور زوال کے بعد۔ طلوع آفتاب کے بعد سے زوال تک کا وقفہ تقریباً" سوا پانچ گھنٹے دنیاوی کاروبار کے لئے پھر گھر آکر کھانے پینے آرام کرنے کے لئے اس دور چہارم تک رکھا گیا تھا۔ غروب آفتاب سے پہلے دن کی آخری یعنی دوسری نماز کا حکم تھا جس کا ابتدائی وقت غروب سے تقریباً" ڈیڑھ گھنٹہ پہلے اول روز والی نماز کے وقت کے برابر کی قدرے کی و بیشی کے ساتھ ٹھہرتا ہے۔

دن کی ایک وقت نماز پوپھٹنے کے بعد سے قبل طلوع آفتاب تک صرف سوا گھنٹہ اور دوسری نماز کا وقت زوال کے بعد سے قبل غروب تک بتانا دین میں اور قرآن مجید میں دونوں میں الحاد کرنا اور قرآنی آیات کی تحریف کرنا

ہے۔ اور اس پر اصرار تو کھلی ہوئی ناخدا ترسی ہے۔

زلفاً" من اللیل

زلف جمع ہے زلفۃ کی۔ رات کے ایک حصہ کو زلفۃ کہتے ہیں جمع کا صیغہ اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ رات کے کئی حصوں میں نماز پڑھی جائے۔ زلفۃ رات کے ابتدائی حصے کے معنی میں بھی اہل لغت لکھتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ کسی کا ابتدائی حصہ ایک ہی ہو سکتا ہے۔ البتہ مختلف اعتبارات کے پیش نظر متعدد ابتدائی حصے ہو سکتے ہیں یہاں جمع کا صیغہ زلفاً" آیا ہے اس لئے کم سے کم تین ابتدائی حصے رات کے ہونا چاہیں تو غروب آفتاب کے بعد رات کا پہلا ابتدائی حصہ آتا ہے پھر غروب شفق کے بعد رات کا دوسرا ابتدائی حصہ آتا ہے اور تیسرا ابتدائی حصہ ادبار النجوم کے بعد یعنی رات کے نصف آخر کا ابتدائی حصہ۔ پہلا ابتدائی حصہ غروب آفتاب کے بعد والا نماز مغرب کا وقت ہے۔ دوسرا ابتدائی حصہ غروب شفق کے بعد والا نماز عشاء کا وقت ہے اور تیسرا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخصوص فریضے اور دوسروں کے لئے تطوع کا وقت ہے اس دور چہارم میں دن کی تو وہی دو نمازیں رہیں جو دور سوم میں تھیں۔ رات کو ایک فرض نماز کا اضافہ ہوا۔ دور دوم و سوم میں رات کو ایک ہی نماز فرض تھی اس لئے دونوں دور کی آیتوں میں صرف "ومن اللیل" فرمایا گیا اور وہ ایک نماز غروب آفتاب کے بعد سے ادبار النجوم کے قبل تک کے اندر پڑھی جاتی تھی۔ اب اس دور چہارم میں رات کو دو نمازیں فرض ہوئیں اس لئے یہاں سابق دونوں دوروں کی آیتوں کی طرح دور چہارم کی آیت میں "ومن اللیل" نہیں فرمایا "وزلفا من اللیل" ارشاد ہوا ادبار النجوم والی نماز دور دوم سے اور ادبار السجود والی نماز دور سوم جو چلی آرہی ہے دونوں اپنی جگہ رہیں۔

پانچواں دور پانچ وقت کی نمازیں بہ تعیین اوقات

دور چہارم کا جب صرف ایک دن باقی رہ گیا تو رات کو غالباً" آخر شب کو تہجد کے بعد یہ آیت اتری۔

واصبر علی مایقولون وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل غروبها ومن اٰناء الیل فسبح اطراف النهار لعلک ترضی۔ ○ (سورہ طہٰ آیت ۱۳۰)

"مخالفین جو کچھ بولتے ہیں اس پر صبر کرو اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو (یعنی نماز پڑھا کرو) طلوع آفتاب سے پہلے اور اس کے غروب سے پہلے اور رات کے بعض وقتوں میں پھر تسبیح کرو۔ دن کے حصوں کے ساتھ تاکہ (منصب صبر کے ساتھ) منصب رضا (بھی) حاصل ہو"۔ (۲۰ : ۱۳۰)

اس آیت کریمہ پر ہمارے مفسرین نے محض سرسری نظر ڈالی اور اس پر غور نہیں کیا کہ اس سے پہلے چاروں دوروں کے متعلق جو چار آیتیں نازل ہوئی تھیں ہر آیت میں پہلے دن کی نماز یا نمازوں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد رات کی نماز کا ذکر فرماکر آیت کو ختم کیا گیا۔ مگر اس آیت میں پہلے دن کی انہیں دو نمازوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جن کا ذکر دور سوم میں بالکل انہیں لفظوں کے ساتھ "قبل طلوع الشمس و قبل الغروب" کے لفظوں میں فرمایا گیا ہے پھر دور چہارم میں ہی دونوں دن کی نمازوں کے وہی دو وقت طرفی النہار کہہ کر ارشاد فرمایا گیا ہے۔ اس آیت میں بھی وہی دو وقت انہی سابق لفظوں میں "قبل طلوع الشمس و قبل غروبها" فرماکر بتایا گیا ہے۔ دن کی دو نمازوں کا ذکر دور سوم کی آیت دور چہارم کی آیت اور پھر اس دور پنجم کی آیت میں بھی بالکل یکساں طریقے سے تعیین وقت کے ساتھ کیا گیا۔ دن کی نمازوں کے بعد رات کی نماز دور سوم میں چونکہ صرف ایک نماز عام فریضے کی حیثیت سے تھی اس لئے صرف "ومن اللیل" فرمایا گیا جس طرح دور دوم میں رات کی صرف ایک ہی فرض نماز ہونے کی وجہ سے "ومن الیل" فرمایا گیا ہے۔ دور چہارم میں رات کی دو نمازیں عام حیثیت سے فرض

ہوئیں اس لئے "زلفا" من اللیل" جمع کا صیغہ "رات کے کچھ حصوں میں"
کہہ کر فرمایا گیا دو نمازیں عام طور سے فرض اور ایک نماز خاص رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے فرض دوسروں کے لئے تطوع یعنی نفل تینوں
رات کی نماز کے لئے جمع کا صیغہ زلفا" لایا گیا کہ ان میں سے ہر نماز رات
کے ایک خاص حصے میں پڑھی جائے۔ اس دور پنجم میں بھی بالکل اسی طرح
رات کی نماز کے لئے جمع کا صیغہ "ومن اناء اللیل" لایا گیا۔ جو "زلفا"
من اللیل" ہی کا مفہوم رکھتا ہے۔ "زلفا" من اللیل" کے معنی ہیں "رات
کے کچھ حصوں میں" اور "من اناء اللیل" کے معنی ہیں "رات کے وقتوں
میں سے" یعنی دور چہارم کی آیت کریمہ اور اس دور پنجم کے یہ آیت کریمہ
"ومن اناء اللیل" تک ہی اگر زیر غور رکھئے تو بالکل ایک ہی مفہوم دونوں
آیتیں رکھتی ہیں اور دونوں آیتوں سے صرف چار ہی وقت کی فرض نمازیں
ثابت ہیں۔ دو نمازیں دن کی اور دو نمازیں رات کی مگر اس آیت کریمہ میں
ایک نئی بات تمام آیات سابقہ سے جداگانہ یہ ہے کہ سابق ہر آیت میں دن
کی نمازوں کے اوقات بتا کر رات کی نماز یا نمازوں کا وقت بتا کر بات ختم
کردی ہے اور اس دور پنجم والی آیت میں دن کی نمازوں کے بالکل وہی
وقت جو دور سوم و چہارم میں تھے بتا کر رات کی نمازوں کے وہی اوقات اسی
طرح بتا کر جو دور چہارم میں تھے پھر دن کی نمازوں کے اوقات دور چہارم
کے بتائے دو وقت بصیغہ تشنیہ کو بصیغہ جمع لا کر یعنی طرفی النہار کی جگہ اطراف
لانہار کہہ کر بتایا گیا ہے۔ تو یہ بلاوجہ نہیں ہو سکتا۔ اول تو حسب معمول
پہلے دن کی نمازوں کے اوقات کے بعد رات کی نمازوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ تو
اب پھر دوبارہ دن کی نمازوں کا ذکر چہ معنی وارد؟ اور دوبارہ ذکر بھی لفظ کی
شکل یعنی صیغہ بدل کر؟ تشنیہ کو جمع بنا کر۔ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ جہاں ع
"ہر لفظ میں اک نکتہ ہے، ہر نکتے میں ایک رمز" قرآن مجید کی بلاغت کو علم و
فن سے بے بہرہ ایسے لوگ جو واو تفسیر کا مفہوم نہ جانیں، من ابتدائیہ کی
[illegible]ت سے ناواقف ہوں، الف لام کی قسموں سے ناآشنا ہوں اور
[illegible]ایانی صغیرا" میں جو "ربیا" ہے اس کو رب سے مشتق بتاتے ہوں۔ اس

پر نہ قیامت کی باز پرس سے ڈرتے ہوں نہ اللہ تعالیٰ کی عقوبت کا کچھ خوف
رکھتے ہوں وہ کیا سمجھ سکتے ہیں۔
میں نے اسی لئے لکھا ہے کہ دور چہارم کا جب صرف ایک دن باقی رہ گیا
تو رات کو یہ آیت اتری غالبا" جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کی نماز
سے فارغ ہو چکے تھے کہ یہ ایک دن جو دور چہارم کا باقی رہ گیا ہے اس میں
تو تم اسی دور چہارم کی طرح دو وقت کی نماز پڑھ لو "قبل طلوع الشمس و قبل
غروبہا" اس دن غروب آفتاب کے بعد چوتھا دور ختم ہو جائے گا۔ سورۃ یسین
کی آیت نمبر ۳۷ میں ہے۔

وایۃ لھم الیل نسلخ منہ النہار فاذاھم مظلمون۔

"لوگوں کے لئے (اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے) ایک نشانی رات (بھی)
ہے جس (پر) سے (آفتاب کی چڑھائی ہوئی) دن (کی چادر) کو ہم کھینچ لیتے ہیں
تو اس وقت لوگ اندھیرے میں ہو جاتے ہیں" (۳۶ : ۳۷) تو پہلے رات تھی
جس کے چند گھنٹوں پر آفتاب نور کی چادر چڑھا دیتا ہے۔ پھر وہ چادر کھینچ لی
گئی تو دوسری رات آجاتی ہے اس لئے دن کے پہلے کی رات اسی دن کی
رات قرار دی گئی ہے اور دن کے بعد والی رات آنے والے دن کی رات
ہوگی۔ تو جس رات اخیر حصے میں جب اس رات کی ساری نمازیں عام و
خاص ادا کی جا چکی تھیں یہ آیت اتری تو اس رات کے بعد والا دن اسی
رات کا دن ہوگا۔ یہ رات اور اس کے بعد والا دن دور چہارم کی آخری
رات اور آخری دن ہیں اس لئے حکم ہوا کہ اس آخری دن میں تم دور
چہارم کے مطابق دو نمازیں "قبل طلوع الشمس و قبل غروب" پڑھ لو۔ اس
کے بعد دور پنجم کی پہلی رات آتی ہے اس رات بالکل دور چہارم ہی کی
طرح دو فرض نمازیں مغرب و عشاء اور ایک فرض خصوصی ادبار النجوم والی
اور ضمیمہ ادبار السجود والی پڑھ لو اگر اس رات کے بعد طرفی النہار (دن
کے اول و آخر دونوں حصوں ہی کے ساتھ نہیں بلکہ) اطراف النہار کے
ساتھ یعنی دن کے تینوں حصوں میں اول و آخر کے حصوں میں تو دور سوم ہی
سے تم پڑھتے ہو۔ صرف درمیانی حصہ اس کا بچا ہوا ہے۔ اس دن سے جو

دور پنجم کا پہلا دن ہے دن کے درمیانی حصے میں بھی ایک نماز پڑھ لیا کرو تاکہ دن کا کوئی حصہ نماز (اللہ تعالی کے ذکر) سے خالی نہ رہے واطراف النہار پر واؤ معیت ہے۔ یہ واؤ معیت اس مفہوم کو پیدا کررہا ہے کہ یہ اناء اللّیل والی رات کے ساتھ اس اطراف النہار والے دن کا شمار ہے۔ یہ دونوں شبانہ یوم اپنے سابق روز و شب سے تعلق نہیں رکھتے ان سے پہلے کے روز و شب دور چہارم کے تھے اور اس روز و شب سے دور پنجم کا حساب شروع ہوگیا "جو آخری دور ہے اور قیامت تک باقی رہے گا اس دور سے دن کی تین فرض نمازیں ہو گئیں ایک دن کے ابتدائی حصے میں دوسری درمیانی حصے میں تیسری آخری حصے میں مگر رات کی وہی دو نمازیں فرض رہیں غروب آفتاب کے بعد اور غروب شفق کے بعد جو دور چہارم میں فرض ہوئی تھیں۔

لیکن یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ دن کا درمیانی حصہ تو طلوع آفتاب سے شروع ہوتا ہے اور زردی آفتاب پر ختم ہوتا ہے اور اس درمیانی حصے کو نصف النہار دو حصوں میں تقسیم کردیتا ہے تو درمیانی نماز نصف النہار سے پہلے پڑھ لی جائے یا نصف النہار کے بعد یا ٹھیک نصف النہار کے وقت ؟ اس لئے دور پنجم کے اسی پہلے دن پہلی یعنی فجر کی نماز کے بعد یہ آیت کریمہ اتری۔

اقم الصلوۃ لدلوک الشمس الی غسق الیل و قران الفجر ان قران الفجر کان مشہود O (سورۃ بنی اسرائیل آیت ۷۸)

نماز کی پابندی قائم رکھو ہر دلوک شمس کے بعد (آخری دلوک کے خاتمہ) رات کی پوری تاریکی تک۔ اور (نماز میں) فجر کے قرآن (کی قرات) کو بلاشبہ فجر (کی نماز) کا قرآن قابل مشاہدہ ہوتا ہے (۱۷: ۷۸) دلوک کے معنی کسی چیز کا اپنی جگہ سے کھسکنا، آہستہ آہستہ ہٹنا ہیں بدن کو ہاتھ سے ملتے ہیں میل چھڑانے کے لئے یا بدن میں تیل لگاتے ہیں تو ہاتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ ملنے میں کھسکتا رہتا ہے اس لئے دلک کے معنی بدن ملنا بھی ہیں، آفتاب کے تین دلوک عام طور سے عرب میں مشہور تھے زوال شمس، زردی شمس اور

غروب شمس۔ حضرت حسان بن ثابت صحابی نعتیہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم رضی اللہ عنہ کا قصیدہ مشہور ہے جس کے دو شعر قطعہ کی صورت میں حسب ذیل ہیں۔

شمس السماء لها دلوک عدة　　حتی تغیب ولا تری اثارها

آسمان والا آفتاب تو اس کے متعدد دلوک ہیں یہاں تک کہ کھسکتے کھسکتے غائب ہوجاتا ہے اور اس کے آثار (تک) تم نہیں دیکھ پاتے۔

ولشمسالی الاستواء مقیمة　　لا تحجبن[۱] غمامته انوارها

اور ہمارا آفتاب (ہر وقت) خط استواء پر مقیم رہتا ہے۔ کسی بدلی کی بھی یہ مجال نہیں کہ اس کے انوار پر حجاب ڈال سکے۔

قرآن مجید نے یہ بتایا کہ شفق بھی آفتاب ہی کے آثار ہیں۔ اس لئے غروب شفق در حقیقت آفتاب کا آخری دلوک ہے تو جب شفق غروب ہوکر رات کی تاریکی فضا میں پھیلا دے غسق الیل ہوجائے تو دلوکات شمس کا سلسلہ ختم ہوتا ہے اسی لئے اقامت صلوۃ کا حکم دیا ہے ہر دلوک کے بعد "لدلوک" پر لام بعدیت کے لئے ہے بعد دلوک الشمس تو جب دلوک شمس متعدد ہیں اور کسی خاص دلوک کی خاص تعیین نہیں فرمائی گئی ہے تو ہر دلوک کے بعد نماز فرض ہوئی زوال کے بعد ظہر کی نماز زردی شمس کے بعد عصر کی نماز غروب کے بعد مغرب کی نماز، **غسق اللیل** یعنی پوری تاریکی چھا جانے کے بعد عشا کی نماز۔ ان چار نمازوں کے اوقات دور پنجم کے پہلے دن وضاحت کے ساتھ ہر وقت کی ابتداء اور ہر وقت کے بعد دوسرے وقت کی ابتداء سے اس سے پہلے والے وقت کی انتہا بھی معلوم ہوگئی۔ رات کی نمازوں میں مغرب کی نماز کا وقت وجود شفق ہی تک رہے گا۔ **غسق لیل** سے مغرب کی نماز کا وقت ختم ہوجائے گا اور عشاء کی نماز کی انتہا تو

---

[۱] اس شعر میں بلاغت یہ ہے کہ آفتاب آسمان تو غروب ہوجاتا ہے اور ہمارا آفتاب صرف غروب ہی سے محفوظ نہیں ہے۔ اتنی بلند شان رکھتا ہے کہ کسی بدلی کی بھی یہ مجال نہیں کہ سامنے آکر حجاب بن جائے اور اس کی روشنی کو دوسروں تک پہنچنے سے روک دے۔ سبحان اللہ۔

ادبار النجوم یعنی نصف شب ہوجانے سے ختم ہوجاتی ہے سابق دوروں سے
معلوم ہے۔

فجر کی نماز کے بعد ہی یہ آیت اتری تھی اور وہ تو دور اول ہی سے فرض
آرہی ہے اس کے ذکر کی ضرورت نہ تھی کسی دور میں سابق دور کی کوئی نماز
منسوخ نہیں کی گئی۔ البتہ سابق دور کی نماز میں کوئی قید لگادی گئی ہے یہ
آخری دور کی آخری آیت تھی ایسا نہ ہو کہ کوئی یہ سمجھے کہ آخری دور میں
چار ہی وقت کی نماز ہردلوک کے بعد فرض ہوئی ہے۔ ظہر سے عشاء تک فجر
کا تو ذکر ہی نہیں ہے۔ ترتیب کے مطابق فجر کا ذکر پہلے ہونا چاہئے۔ ظہر سے
ذکر شروع کیا گیا اس آیت سے فجر کی نماز منسوخ تو نہیں ہوگئی۔ اس شبہے کو
دور کرنے کے لئے آخر میں فجر کی نماز کا ذکر قرآن الفجر کے لفظ سے کیا گیا
چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز میں قرآت کو طویل فرماتے تھے
اس لئے اس نماز کے پسندیدہ حصے سے اس نماز کا ذکر کیا گیا نماز کو قرآن
مجید میں صلوۃ، تسبیح، رکوع، سجود، مسجد کے الفاظ سے ذکر کیا گیا۔ یہ سب
الفاظ نماز کے معنی میں قرآن میں آئے ہیں۔ اس آیت میں قرآن الفجر
اضافت کی وجہ سے نماز فجر کے معنی میں آیا اور اس میں ایک پہلو ترغیب کا
بھی ہے کہ فجر کی نماز میں قرآت طویل ہونی چاہئے اور مزید ترغیب کے لئے
بھی فرمادیا کہ "**ان قران الفجر کان مشھودا** یہاں قرآن کے لفظ سے قرات
اور الفجر سے نماز فجر مراد ہے یعنی فجر کی نماز کی طویل قرآت جو خشوع و
خضوع کے ساتھ ہو قابل مشاہدہ، قابل دید و شنید چیز ہوتی ہے۔ یعنی اللہ
تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔

اس آیت میں پانچوں نمازوں کا ذکر ہے اور ہر نماز کی ابتداء و انتہا
بتادی گئی ہے بعض قبل سے سب کو معلوم ہے سابق دوروں میں اس کی انتہا
بتادی گئی ہے دور پنجم کے پہلے دن یہ آیت اتری تھی چار نمازوں کی ابتداء و
انتہا سب کو معلوم تھی سارے مومنین پڑھ رہے تھے یعنی نماز دن کے اول و
آخر حصوں کے درمیان اس دور میں ایک نئی پانچویں نماز فرض ہوئی ہے پہلی
آیت جو آخر شب میں اتری تھی اس میں صرف دن کے درمیانی حصے میں بھی

نماز پڑھنے کا حکم ہوا تھا مگر اس درمیانی حصہ روز والی نماز کے وقت کی
ابتداء و انتہاء نہیں بتائی گئی تھی کہ فجر کی نماز پڑھ چکنے کے بعد درمیانی حصہ
روز والی نماز کے حکم کی تعمیل ہوتی۔ اگر ضرورت تھی تو صرف اسی درمیانی
حصہ روز والی نماز کی ابتدائے وقت و انتہائے وقت بتانے کی اس لئے پہلے
جس نئی نماز کی ابتداء و انتہائے وقت بتانے کی ضرورت تھی اسی سے شروع
کرکے ایسی بلاغت کے ساتھ صرف ایک "دلوک الشمس" کا لفظ بتلاکر ظہر ہی
نہیں بلکہ "**الی غسق الیل**" فرماکر چار وقتوں کی ابتداء و انتہا بتادی۔ نماز
فجر کی ابتداء بتانے کی ضرورت نہیں۔ فجر کا لفظ خود طلوع فجر کو اس کی ابتدا
بتارہا ہے اور انتہا تو قبل طلوع الشمس کے لفظ سے دور دوم ہی سے سب کو
معلوم ہے۔

قرات نماز

کتاب الصلوۃ کے مصنف نہ قرآن مجید کے سمجھنے کی صحیح صلاحیت رکھتے ہیں نہ نماز کی حقیقت سے واقف ہیں "روایتی قرات" کا عنوان قائم کرکے لکھتے ہیں کہ "حضور خداوندی میں دست بستہ کھڑے ہوکر اپنے پروردگار کو "**ایاک نعبد وایاک نستعین**" سے مخاطب کرنے کے بعد عام قران پڑھنا شروع کردیتا ہے "**انا اعطینک الکوثر**" جس ذات مقدس کو ابھی ابھی کہا جارہا تھا ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں اسی ذات ذوالجلال کو اسی خطاب کے ساتھ کہا جاتا ہے ہم نے تجھ کو کوثر عطا کیا ہے "**فصل لربک وانحر**" تو اپنے رب کی نماز پڑھ کر" جو بے چارے عربی نہیں جانتے وہ صرف اتنا ہی سمجھ کے پڑھتے ہیں کہ ہم اللہ تعالی کا کلام پڑھ رہے ہیں وہ معنی مطلب کچھ سمجھتے نہیں اس لئے وہ تو مرفوع القلم ہیں اور کتنے بدنصیب ایسے ہیں جو عربی جانتے ہیں مگر کمسنی سے یا زمانہ طالب العلمی سے بے سمجھے بوجھے پڑھنے کی عادت رہی۔ اس لئے عالم ہوجانے کے باوجود معنی و مفہوم کی طرف دھیان نہیں دیتے اتفاق سے کسی جملے کا مفہوم بلا ارادہ ذہن میں آجائے یہ اور بات ہے خود ان کی یہ عادت ہی نہیں رہی کہ وہ نماز کو نماز کی طرح ایک عبادت سمجھ کر ادا کریں بلکہ وہ عادۃ" نماز پڑھتے ہیں ان سے بھی بحث نہیں مگر **لیسوا سواء**" سب علماء ایسے نہیں ہیں سمجھ سمجھ کے خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھنے والے بھی بفضلہ و توفیقہ تعالی بہتیرے اہل علم ہیں وہ سورہ فاتحہ کے بعد مناسب حال و مناسب جذبات ہی آیات پڑھتے ہیں جن سے ان کے خشوع و خضوع میں اضافہ ہوتا ہے مگر نماز بھی ایک ایسی چیز ہے جس کو مقولہ اضافت سے کہا جائے تو غلط نہ ہوگا اس لئے کہ نماز مکمل حاضری ہے الہ العلمین کی بارگاہ میں عابد و معبود کا آمنا سامنا ہوتا ہے بندہ اپنے معبود کی حمد و ثنا کرکے اقرار عبدیت و استعانت کے بعد ہدایت طلبی کی دعا کرتا ہے تو اگر اس کے جذبہ تضرع کی تشنگی بجھی نہیں ہے تو سورہ فاتحہ کے بعد بھی خشوع و خضوع انگیز ہی آیتیں پڑھ کر اپنے جذبہ تضرع کی پیاس

بجھاتا ہے اور بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ اپنے مالک اور اپنے رب کے سامنے حمد و ثنا و اقرار عبدیت و استعانت و دعا کے بعد ولولہ عبدیت چاہتا ہے کہ مالک کی طرف سے بھی کچھ ہمت افزائی کچھ تسلی و تسکین کچھ حسب حال و وقت موعظت کی باتیں ارشاد ہوتیں تو ہمت افزائی' تسلی و تسکین۔ موعظت کی آیتیں اس طرح سورہ فاتحہ کے بعد پڑھتا ہے جیسے اللہ تعالی خود فرمارہا ہے گو الفاظ خود اس کے منہ سے نکل رہے ہیں جیسے کسی کا خط کوئی پڑھتا ہے تلفظ الفاظ کے اعتبار سے تو الفاظ اس کے منہ سے ادا ہورہے ہیں مگر باتیں خط لکھنے والے کی ہیں سورہ فاتحہ پڑھنے کے بعد جس نے "**انا اعطینک الکوثر**" سمجھ کر پڑھا اس نے یہ سمجھ کر پڑھا کہ میرا مالک مجھ کو میری دعا و التجا کا یہ جواب دے رہا ہے کہ "**انا اعطینک الکوثر**" اور یہ حقیقت ہے کہ رب العلمین نے اپنے ہر بندے کو اس کی حیثیت کے مطابق خیر کثیر دیا ہے۔ **ان تعدوا نعمتہ اللہ لا تحصوھا** (اگر اللہ تعالی کی بخشی ہوئی نعمتوں کو گننا چاہو تو تم سب کا احصا نہیں کرسکتے) مصنف الصلوۃ نے کس قدر غلط اور جھوٹ لکھا ہے کہ ابھی ابھی کہا جارہا تھا کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں اسی ذات ذوالجلال کو اسی خطاب کے ماتحت کہا جاتا ہے کہ ہم نے تجھ کو کوثر عطا کیا ہے "اسی خطاب کے ماتحت" یہ کتنا کھلا جھوٹ ہے "**ایاک نعبد وایاک نستعین**" کے بعد وہ مخاطبت تو ختم ہوگئی اس کے بعد دعا کی مخاطبت ہے جو ختم سورۃ فاتحہ کے ساتھ ختم ہوگئی اس کے بعد نمازی بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھتا ہے اقرار و اعتراف و دعا اور ساری مخاطبتیں ختم ہوجانے کے بعد بسم اللہ الرحمن الرحیم نے ایک نیا عنوان شروع کیا جس طرح "انا اعطینک الکوثر" میں متکلم اللہ تعالی ہے اسی طرح نمازی اس وقت بھی اللہ تعالی کو متکلم سمجھ رہا ہے نزول سورہ کے وقت ضمیر مفعولی کاف خطاب کے مخاطب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے مگر آپ کے دامن نبوت کے زیر سایہ ہر سچا مومن اس مخاطبت میں شریک ہے جس طرح اقم الصلوۃ وغیرہ کی مخاطبت میں ہر مومن اپنے رسولؐ کا طفیلی بنا شریک خطاب ہے اسی طرح انا اعطینک الکوثر کی مخاطبت میں بھی ہر

مومن صالح اپنے رسولؐ کا اپنے رسولؐ کے طفیل میں یہاں بھی شریک مخاطبت ہے یہ میں نے جواب دینے کے لئے ایک بات نہیں بنائی ہے باللہ العظیم میں ایک مدت سے اسی طرح نماز پڑھتا ہوں میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ والضحیٰ یا سورہ الم نشرح پڑھتا ہوں تو میں نہیں لکھ سکتا کہ اس وقت میرا کیا عالم ہوتا ہے والعصر پڑھتا ہوں تو بڑا سبق موعظت کا ملتا ہے اس لئے اکثر پڑھتا ہوں۔ خصوصاً اب کہ ضعف پیری سے دیر تک قیام نہیں کرسکتا۔ قل ہواللہ احد یا قل اعوذ برب الفلق یا قل اعوذ برب الناس پڑھتا ہوں تو یہ سمجھ کر کہ میرا رب مجھ سے فرما رہا ہے میری دعا کے جواب میں قل۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فرمایا اس کے بعد میں حکم کی تعمیل کرتا ہوں نماز جس طرح مالک کے سامنے عرض معروض کا موقع ہے مالک سے تسلی و تسکین حاصل کرنے کا موعظت و بشارت سننے کا بھی بہترین موقع ہے۔ سورہ فاتحہ کے بعد موعظت و بشارت کی آیتیں بندہ مالک کی طرف سے پڑھتا ہے اور اپنے گوش دل سے سنتا ہے۔

قرآن مجید میں خود بعض جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اور اپنے رسول اور ان کے متبعین کے نفسیات کے درمیان مکالمہ کی نوعیت قائم کرکے ایک عجیب کیف آور ایمان افروز فرحت بخش لطافت پیدا فرمادی ہے کہ سمجھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ مثلاً سورۃ البقرہ کا آخری رکوع پڑھئے للہ مافی السموات وما فی الارض (اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ سارے آسمانوں میں ہے اور جو کچھ ساری زمین میں ہے یعنی کوئی اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے یا نہ لائے کوئی اس کی عبادت کرے یا نہ کرے اللہ تعالیٰ کو کسی کی کچھ پرواہ نہیں وان تبدوا مافی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ فیغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء ط واللہ علیٰ کل شئی قدیر (سورۃ البقرہ آیت ۲۸۴) (تم لوگ اپنے جی کی باتیں ظاہر کرو یا چھپاؤ۔ اللہ تعالیٰ اس کا محاسبہ ضرور کرے گا (محاسبے کے بعد اس کو اختیار ہے) جس کو مناسب سمجھے گا بخش دے گا اور جس کو مناسب سمجھے گا عذاب کرے گا اللہ تعالیٰ ہر بات کی قدرت رکھتا ہے) (۲ : ۲۸۴) اس اعلان عام کے بعد اس کا کیا اثر رسولؐ اور مومنین پر پڑا۔ اور ان

کے دلوں پر کیا گزری ہوگی۔ انسانی نفس تو خیالات و خواہشات و اوہام و افکار کی آماجگاہ ہوتا ہے خدا جانے کب کب کون کون سی باتیں دل میں آتی رہتی ہیں۔ اللہ اکبر سب کا محاسبہ ہوگا؟

زندگی بھر کے سب اعمال کی پرسش ہوگی
اور یہاں کچھ بھی محبت کے سوا یاد نہیں

بخشش و بخشائش کی امید دلائی گئی ہے تو پھر عذاب سے ڈرا بھی دیا گیا ہے کیا معلوم کس کو بخشا جائے گا اور کس کے لئے عذاب کا حکم ہوگا تو پھر بندہ نے تدبیر یہ سوچی کہ حالت کفر کا سب گناہ ایمان لانے کے بعد معاف ہوجاتا ہے تو بہتر یہ ہے کہ نئے سرے سے ایمان لے آئیں۔ امن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمومنون کل امن باللہ وملئکتہ وکتبہ ورسلہ لا نفرق بین احد من رسلہ (سورۃ البقرہ آیت ۲۸۵) (پہلے تو یہ اعلان عام نازل ہوا ہے اس پر ایمان کا اقرار رسولؐ اور سارے مومنین نے کیا اس کے بعد تجدید ایمان کی سب کے سب اللہ تعالیٰ پر اس کے فرشتوں پر اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آئے۔ یہ اقرار کرتے ہوئے کہ ہم لوگ اس کے رسولوں میں سے کسی کے متعلق کوئی فرق نہیں کرتے تجدید کے بعد اب اس اعلان عام کے متعلق کس عجز و ادب کے ساتھ عذر خواہ ہوتے ہیں۔ دیکھئے (وقالو اسمعنا واطعنا غفرانک ربنا والیک المصیر (سورۃ البقرہ آیت ۲۸۵) سب نے عرض کیا کہ یہ اعلان عام جو ارشاد ہوا ہے "اے ہمارے رب ہم لوگوں نے گوش و دل سے سن لیا اور سر اطاعت خم کردیا مگر اے ہم سب کے رب! (ہم لوگ) تیری مغفرت کے امیدوار ہیں۔ اور تیری ہی طرف تو ہم لوگوں کو (بالآخر) پہنچنا ہے (۲ : ۲۸۵) اس تضرع کا جواب بارگاہ رب العلمین سے ارشاد ہوا گھبراؤ نہیں لایکلف اللہ نفسا الا وسعھا لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت (سورۃ البقرہ آیت ۲۸۶) اللہ تعالیٰ کسی پر اس کی وسعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا جو نیکیاں جس نے کمائی ہیں اس کو ان کا نفع مل کررہے گا۔ اور جس نے برائیاں کمائی ہیں ان کا وبال تو اس پر پڑے گا (۲ : ۲۸۶) اتنی ہلکی سی تسلی سے اس اعلان عام کے باعث سہمے

ہوئے قلوب کیا تسلی پاسکتے تھے سب کے سب بے اختیار گڑ گڑا گڑ گڑا کر التجا کرنے لگے۔ ربنا لا تواخذنا ان نسینا او اخطاءنا ربنا ولا تحمل علینا اصرا کما حملتہ علی الذین من قبلنا ربنا ولا تحملنا مالا طاقتہ لنا بہ واعف عنا واغفرلنا وقف وارحمنا وقف انت مولنا فانصرنا علی القوم الکفرینط (سورۃ البقرہ آیت ۲۸۶) (اے ہمارے رب اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو ہم لوگوں سے مواخذہ نہ فرما اے ہمارے رب ہم پر ایسا بوجھ (غیروں کی اطاعت کا) نہ ڈال جیسا کہ تونے ہمارے اگلوں پر ڈال دیا اے ہمارے رب ہم لوگوں پر ایسا بوجھ نہ ڈال جس کی برداشت کی قوت ہم لوگوں میں نہ ہو اور ہم لوگوں کو معاف کردے اور ہم لوگوں کو بخش دے اور ہم لوگوں پر رحم فرما تو ہی ہم لوگوں کا مالک و کارساز ہے تو (جب کافروں سے ہمارا مقابلہ ہو) تو کافروں پر ہم لوگوں کو اپنی مدد سے ظفریاب کر۔ (۲:۲۸۶) دیکھا آپ نے اس مکالے کو؟ نماز میں اللہ تعالی سے اس کے عبادت گزار نمازی بندے کا شرف مکالمہ حاصل ہوسکتا ہے اور الحمد اللہ ثم الحمد اللہ کہ یہ اپنے رب کا نابکار وسیہ کار بندہ برابر اس شرف سے مدت سے مشرف ہوتا رہتا ہے فالحمد للہ علی توفیقہ ولا فخروما ہذا الا تحدیث نعمتہ والشکر علی توفیقہ واللہ تعالی علیم بذات الصدور۔

نہ اس پر فخر ہے اور نہ اس کا غرور
کہ ربی علیم بذات الصدور
میں سب سے زیادہ گنہگار ہوں
نہیں لیکن ایمان میں کچھ فتور
رگ جان سے بھی ہے جو نزدیک تر
وہ کب میرے دل اور نظر سے دور
عقائد ہیں اپنے اصح الصحاح
عمل میں مگر ہورہا ہے قصور
بھروسا ہے لا تقنطوا کا فقط
و ربی رحیم، عفو، غفور!

ایک اور بات

مصنف الصلوۃ نے قرآت نماز کے متعلق بار بار ولا تجھر بصلوتک ولا تخافت بھا واتبغ بین ذالک سبیل (سورۃ بنی اسرائیل آیت ۱۱۰) کو پیش کیا ہے تم اپنی نماز کو۔ (اے رسول) نہ بلند آواز سے پڑھو نہ بالکل آہستہ ان دونوں کے درمیان ایک (اوسط درجے کی) راہ اختیار کرو۔ (۱۷:۱۱۰) مصنف الصلوۃ نے صلوتک کی ترکیب اضافی کا مطلق خیال نہیں کیا اور ساری فرض نمازوں کے لئے اس حکم کو سمجھ لیا اگر ہر نماز کے لئے یہ حکم ہوتا تو صلوتک (خاص رسولؐ کی نماز) ترکیب اضافی کے ساتھ ہرگز نہیں کہا جاتا صرف "ولا تجھر بالصلوۃ ولا تخافت بھا" فرمایا جاتا کہ تم نماز نہ زور سے پڑھا کرو نہ آہستہ "بصلوتک" تم اپنی نماز نہ زور سے پڑھو نہ آہستہ "اپنی" کی قید صاف بتا رہی ہے کہ یہ حکم خاص نماز کے لئے ہے جو صرف رسولؐ ہی پر فرض تھی۔

سورہ مزمل کے آخری رکوع میں جو ہے ان ربک یعلم انک تقوم ادنی من ثلثی اللیل ونصفہ وثلثہ وطائفہ من الذین معک (سورۃ المزمل آیت ۲۰) تمہارا رب جانتا ہے کہ تم (نماز میں) قیام کرتے ہو دو تہائی رات آدھی رات اور ایک تہائی رات تک اور تمہارے ساتھیوں میں سے (بھی) ایک جماعت (۷۳:۲۰) تو حضور اکرمؐ نہ ان لوگوں سے کہتے تھے کہ وہ لوگ بھی آکر شریک ہوجایا کریں نہ اللہ تعالی نے اشارۃ" کنایتہ" لوگوں کو اس کی خاص طور سے ترغیب دی تھی صرف رسولؐ کی قرات کی آواز اپنے حجروں میں سنکر ولولہ عبدیت کے جوش میں مسجد کے آس پاس رہنے والے اپنے اپنے حجروں سے قرات رسولؐ کی آواز سن کر وضو کرکے مسجد پہنچ جاتے تھے اور اپنے رسول کے ساتھ شریک نماز ہوجاتے تھے۔ اس نے ایک بات تو اسی جگہ پر فرمائی گئی کہ علم ان سیکون منکم مرضی واخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللہ واخرون یقاتلون فی سبیل اللہ فاقرء واما تیسرمنہ (سورۃ

المزمل آیت ۲۰) "اللہ تعالی کو یہ علم ہے کہ تم میں سے بعض عنقریب بیمار بھی پڑنے والے ہیں اور بعض اپنے کاروبار کے سلسلے میں اللہ تعالی کے فضل کی امید پر (دن کو) چل پھر کرنے والے بھی ہیں اور دوسرے وہ لوگ بھی ہیں جو اللہ تعالی کی راہ میں جہاد کرتے رہتے ہیں (رات کو دیر شب تک ان کا نماز نفل میں مصروف رہنا ان کے دن کے ضروری مشاغل میں ضرور حارج ہوگا' اس لئے قرآن سے اسی قدر پڑھو جتنا سہل ہو لوگوں کے لئے دشواری کا باعث نہ ہو (۷۳ : ۲۰) اس آیت میں آنحضرتؐ کو حکم ہوا کہ تم اپنی نماز بلند آواز سے نہ پڑھا کرو کہ دوسروں کے حجروں تک آواز پہنچے اور دوسروں کے ولولہ عبودیت میں جوش پیدا ہو اور وہ اپنے دن کی معروفیتوں کا خیال کئے بغیر بستر سے اٹھ کر وضو کرکے مسجد میں آجائیں اور تمہارے پیچھے کھڑے ہوجائیں اور بالکل آہستہ قرات بھی نہ کرو کہ جو تمہاری قرات کے انتظار میں کان لگائے ہوئے ہے اس کو خبر ہی نہ ہو کہ تم نے نماز شروع کردی بس اوسط درجہ کی آواز سے قرات کرو کہ جو بستر پر سونے کی کیفیت میں ہے اس کے کانوں تک آواز نہ آجائے اور جو تمہاری قرات کی طرف کان لگائے منتظر ہے وہ تمہاری قرات سن لے اور مسجد آنا چاہے تو آجائے مسجد آکر اپنے رسولؐ کے ساتھ شریک نماز ہونے سے لوگوں کو منع کرنا بھی مقصود نہ تھا اور یہ بھی مقصود نہ تھا کہ لوگ دیر تک شوق عبادت میں جاگا کریں اور دن کو ان کا حرج کار ہو اس لئے لوگوں کے شوق عبادت و ولولہ عبودیت کی قدر افزائی باقی رکھتے ہوئے باحسن وجوہ اللہ تعالی نے اپنے بندوں کو ان کے دن کے حرج کار سے بچانے کی تدبیر اپنے رسولؐ کو بتائی اس آیتہ کریمہ "**ولا تجہر بصلوتک الایتہ**" کو ہر نماز پر چپاں کرنا اس کی دلیل ہے کہ مصنف **الصلوۃ** کو قرآنی آیات میں تدبر کرنے کی مطلق صلاحیت نہیں ہے اور وہ قرآن فہمی کا جو غرور رکھتے ہیں وہ محض ان کا فریب نفس ہے۔

جہری و سری نمازیں

ازروئے سبیل المومنین عہد نبوی سے آج تک ساری امت میں فجر' مغرب اور عشاء تین وقت کی نمازیں جہری پڑھی جاتی ہیں۔ یعنی ان میں قرات جہری ہوتی ہے۔ سورہ فاتحہ اور اس کے بعد کوئی سورہ یا کچھ آیتیں بلند آواز سے پڑھی جاتی ہیں کہ جماعت کی پہلی دوسری اور کچھ تیسری صف کے لوگ بھی سن سکیں اور ظہر و عصر کی دو نمازیں سری ہوتی ہیں یعنی امام آہستہ قرات کرتا ہے کہ اگر امام صرف ایک آدمی کے ساتھ بھی پڑھ رہا ہو تو وہ بھی باوجود امام کی بغل میں کھڑے ہونے کے امام کی قرات نہ سن سکے مگر امام دو ایک لفظ قریب کے مقتدیوں کو سنا دے تو یہ بھی مسنون ہے نماز کے ارکان و اذکار اور نماز کے متعلق ساری باتیں تو حضور صلعم کو ابتدائے نبوت ہی میں غیر قرآنی وحی کے ذریعے بتوسط حضرت جبریل بتادی گئی تھیں اور آپؐ تعلیم جبریل کے مطابق نماز پڑھتے آرہے تھے۔ اس وقت سے جب صرف ایک وقت کی نماز فرض ہوئی تھی بغیر تعین وقت کے اور صحابہؓ جو اس وقت محض گنتے چند ہی تھے۔ آپ کے ساتھ آپؐ کے پیچھے مقتدی بنکر یا اپنے گھر پر تنہا پڑھتے تھے پھر تعیین وقت کے ساتھ دو وقت پھر تین وقت پھر چار وقت کی نماز فرض ہوئی یہاں تک کہ حضورؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور مقام قبا میں پانچویں وقت کی نماز بھی فرض ہوگئی مگر نماز برابر اسی غیر قرآنی وحی تعلیم جبریل کے مطابق ہی پڑھی گئی قرآنی آیات سے جزئیات نماز تلاش کرکرکے نماز کی ہیئت قائم نہیں کی گئی مگر اللہ تعالی نے دینی احکام کے متعلق ہر غیر قرآنی وحی جو کسی وقت بھی آئی تھی اس کا ذکر قرآن مجید میں ضرور فرمادیا ہے تاکہ وہ دینی غیر قرآنی وحی بالکل غیر قرآنی نہ رہے۔ سورہ اعراف مکی سورہ ہے صرف اس کی آیات ۱۶۳ سے ۱۷۰ تک آٹھ آیتیں مدنی ہیں جیسا کہ علماء نے تاریخ القرآن میں لکھا ہے مگر میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں میرے نزدیک سورہ اعراف کی آخری تین آیتیں بھی مدنی ہیں واللہ اعلم بہرحال ان آخری تین آیتوں میں پہلی آیت ۲۰۴ ہے **واذا قرئی القران فاستمعوالہ**

وانصتوا لعلکم ترحمون۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں قرأت فرماتے تھے تو صحابہؓ بھی مقتدی کی حیثیت سے چپکے چپکے قرأت کرتے رہتے تھے اس کی ممانعت آئی کہ جب قرآن مجید پڑھا جائے تو کان لگا کے سنو چپ رہ کر سنو۔ تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ آیت آپؐ کی یعنی امام کی جہری قرأت باآواز بلند قرأت کی کھلی دلیل ہے کیونکہ کان لگا کے سننے اور چپ رہ کر سننے کا حکم اسی حالت میں ہوگا جب کہ قرأت باآواز بلند ہو اور مقتدیوں کو امام کی قرأت سننے کا موقع ہو۔ سری قرأت جب امام آہستہ پڑھ رہا ہو تو مقتدیوں کا کچھ سننے کا امکان نہیں تو جس وقت سننے کا امکان ہی نہ ہو اس وقت سننے کا حکم کس طرح ہوسکتا ہے اور چپ رہنا تو کان لگا کے سننے کے لئے ہے جب سننے ہی کا امکان نہیں تو پھر چپ رہنا کس غرض سے ہوگا؟ اس کے بعد دوسری آیت ہے **واذ کر ربک فی نفسک تضرعا وخیفتہ ودون الجھر من القول بالغدو والاصال** ط یہاں ذکر کا حکم فی نفسک کا فرمایا گیا یعنی چپکے چپکے تضرعاً" وخیفۃ گرویدگی کے ساتھ اپنے رب سے ڈرتے ہوئے اور صبح کے وقت اور آصال کے وقتوں میں دون الجھر بلند آواز سے قریب آواز سے ذکر کا حکم ہے آصال اصیل کی جمع ہے۔ اصیل کے وقت کے متعلق صحیح قول ابن الفارس کا ہے غروب آفتاب سے نصف شب تک جس میں مغرب عشاء بلکہ تہجد بھی تین نمازیں آجاتی ہیں اس لئے آصال بصیغہ جمع لایا گیا ان تینوں نمازوں کے اوقات کو بتا رہا ہے مطلب یہ ہے کہ فجر کی نماز اور آصال کے وقتوں کی مغرب عشا اور تہجد کی نمازیں دون الجھر بلند آواز سے قریب قدرے پست آواز سے قرأت کرو اور باقی نمازوں میں قرأت آہستہ آہستہ ہو اسی لئے ظہر و عصر اور نوافل ماثورہ وغیرہ۔ (ماثورہ میں قرأت آہستہ ہوتی ہے) فی نفسک کے بعد ودون الجھر دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں ایک ہی حکم سمجھنا غلط ہے ودون الجھر میں واؤ استیناف ہے دون الجھر کے اوقات کی تعین کے بعد ضرورت نہ رہی کہ فی نفسک کے اوقات کی تعین بھی کردی جائے۔

آخری آیت **ان الذین عند ربک لا یستکبرون عن عبادتہ ویسبحونہ ولہ یسجدون** ط وہ اللہ کے بندے جو تمہارے رب کے حضور میں حاضر رہتے ہیں

(فرشتے) وہ اپنے کو بڑا سمجھ کر تمہارے رب کی عبادت سے کتراتے نہیں ہیں وہ اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور اسی کے آگے سجدے کرتے ہیں۔ اس آیت سے اس کا پتہ ملتا ہے کہ سجدے میں صرف تسبیح و حمد ہی کی گنجائش ہے۔ سجدے کا مقام بڑے ادب کا مقام ہے تلاوت و قرأت کے لئے قیام ہے۔ رکوع و سجود صرف تسبیح و تحمید کے لئے ہے اور بس دعاؤں کے لئے سجدوں کے بعد بحالت قعود یعنی ارکان مفروضہ ادا کرنے کے بعد قیام و رکوع و سجود تین ارکان فرض ہیں۔ فرض ارکان کے اذکار معین ہیں ان میں رد و بدل جائز نہیں چونکہ اصل نماز دو ہی رکعت شروع سے فرض چلی آرہی تھی جنگ بدر سے قبل تک بلکہ جنگ بدر تک فتح جنگ بدر کے شکریہ میں ظہر، عصر و عشاء کی تین نمازوں میں دو دو رکعتوں کا اضافہ ہوا اور مغرب کی نماز میں صرف ایک رکعت کا اضافہ ہوا۔